مئی ۱۹۹۵ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

- تنظیمِ اسلامی کی دعوت
  امیرِ تنظیم کا ایک جامع خطاب
- سہ روزہ مشاورتی اجتماع — ایک جائزہ

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

امتحانات سے فارغ طلبہ کے لئے

اسلامک جنرل نالج ورکشاپ

27 مئی تا 20 جولائی 1995ء

قرآن کالج لاہور

میں منعقد ہوگی (ان شاءاللہ)، جس میں مندرجہ ذیل مضامین کی تدریس ہوگی :

1 ۔ نماز و قراءتِ قرآن کی تصحیح
2 ۔ مطالعہ دینی لٹریچر
3 ۔ قرآن حکیم کے منتخب اسباق
4 ۔ عربی گرامر (ابتدائی)
5 ۔ ارکان اسلام اور ان سے متعلق تفصیلات

نوٹ

- اس کورس میں رجسٹریشن کی آخری تاریخ 25 مئی ہے۔
- اوقات تعلیم صبح 8 بجے سے 12 بجے دوپہر ہوں گے۔
- کورس فیس مبلغ 250 روپے ہے، جس میں جملہ کتب کی قیمت شامل ہے۔
- ہاسٹل میں رہائش کی محدود گنجائش ہے۔ خواہش مند طلبہ رجسٹریشن کے وقت ہاسٹل فارم حاصل کریں۔
- ہاسٹل میں 8 ہفتے کے قیام و طعام کا خرچ 1000 روپے ہوگا۔
- مستحق طلباء کے لئے رعایت کی گنجائش ہے۔
- تدریس کا آغاز ان شاءاللہ 27 مئی سے ہو جائے گا۔

المعلن : پرنسپل قرآن کالج لاہور

191۔ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور، فون : 5833637

زیر اہتمام : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۴
شمارہ: ۵
ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
مئی ۱۹۹۵ء
فی شمارہ ۷/-
سالانہ زرتعاون ۷۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت	۷۵ سعودی ریال یا ۲۰ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ۔	۱۶ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۲۰ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر۔	۹ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۵۸۶۹۵۰۲-۵۸۶۹۵۰۱

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرضِ احوال ———— ۳
سہ روزہ مشاورتی اجتماع۔۔ایک جائزہ
حافظ عاکف سعید

☆ احوال و ظروف ———— ۱۳
ملکی و بین الاقوامی حالات پر امیر تنظیم اسلامی کا تبصرہ'
خطباتِ جمعہ کے پریس ریلیز کے آئینے میں

☆ تنظیم اسلامی کی دعوت ———— ۱۷
تنظیم اسلامی حلقہ لاہور کے دعوتی اجتماع سے امیر تنظیم کا خطاب

☆ الھدیٰ (قسط ۱۰) ———— ۴۰
صلح حدیبیہ۔ایک عظیم فتح
سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی روشنی میں (۲)
ڈاکٹر اسرار احمد

☆ بحث و نظر ———— ۴۷
انتخابی طریقہ کار نظام کی تبدیلی کے لئے کیوں مفید نہیں؟
ابو عمیر مہرانی

☆ "تقدیم" بر دستورِ انجمن ———— ۷۰
مرکزی انجمن خدام القرآن کے نظر ثانی شدہ دستور کا مقدمہ
ڈاکٹر اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

سہ روزہ مشاورتی اجتماع۔ ایک جائزہ

تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام سہ روزہ خصوصی مشاورتی اجتماع، حسب اعلان ۲ تا ۴ اپریل لاہور میں منعقد ہوا۔ یہ اجتماع صرف ملتزم رفقاء کے لئے مخصوص تھا اور اس میں شرکت کے لئے نہ صرف پاکستان کے کونے کونے سے ملتزم رفقاء تشریف لائے بلکہ بیرون پاکستان سے بھی چند رفقاء نے بطور خاص اس پروگرام کے لئے شد رحال کیا۔ امریکہ کے تین مختلف شہروں سے اس مقصد کے لئے تشریف لانے والے رفقاء کی تعداد چھ تھی۔ جبکہ ابو ظبی اور شارجہ سے بھی نمائندہ رفقاء نے اس میں شرکت کی۔ مجموعی طور پر ۳۰۰ سے زائد افراد اس مشاورتی اجتماع میں شریک ہوئے اور یوں ایک قدرے چھوٹے پیمانے پر سالانہ اجتماع کا سا سماں بندھ گیا۔ بحمد اللہ یہ پروگرام ہر اعتبار سے نہایت بھرپور اور کامیاب رہا۔

وہ کون سے امور تھے جن پر امیر تنظیم اسلامی کو مشاورت کے لئے ملتزم رفقاء کا اجتماع بلانے کی ضرورت محسوس ہوئی، اس کی صراحت امیر تنظیم کے اس خط میں صاف الفاظ میں مل جاتی ہے جو اجتماع سے ایک ہفتہ قبل تمام ملتزم رفقاء کے نام روانہ کیا گیا تھا۔ اس خط میں اس اجتماع کے انعقاد کا مقصد اور مشورہ طلب امور کی تفصیل مذکور تھی۔ آگے بڑھنے سے قبل مناسب ہوگا کہ اس خط کے متعلقہ حصوں پر ہم ایک نظر ڈال لیں :

محترم رفقائے تنظیم اسلامی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ،

تنظیم اسلامی کا باضابطہ قیام مارچ ۱۹۷۵ء میں عمل میں آیا تھا۔ گویا اس ماہ اس نے اپنی عمر کے پورے بیس سال مکمل کر لئے ہیں۔

ادھر آئندہ ماہ راقم الحروف کی حیات دنیوی کے بھی شمسی حساب سے تریسٹھ سال پورے ہو جائیں گے۔ (جو قمری حساب سے پینسٹھ کے لگ بھگ ہوں گے۔)

یہی وجہ ہے کہ گزشتہ سالانہ اجتماع منعقدہ اکتوبر ۹۴ء کے موقع پر میں نے اعلان کیا تھا کہ میرے بعد تنظیم کی امارت کے مسئلے کے ضمن میں جو دو متبادل صورتیں ہمارے نظام العمل میں درج ہیں ان میں سے کسی ایک کے بارے میں حتمی فیصلے کے لئے رفقاء سے مشورے کے لئے تنظیم کے ملتزم رفقاء کا ایک کل تنظیم خصوصی اجتماع اپریل ۹۵ء میں منعقد ہو گا۔ جو اب' ان شاء اللہ العزیز' ۲ تا ۴/ اپریل لاہور میں منعقد ہو رہا ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ رفقاء کے لئے اس اجتماع میں شرکت کو "میسر" فرمادے۔

ساتھ ہی رفقاء سے بھی اپیل ہے کہ وہ اس سلسلے میں کسی کسل یا سہل انگاری کو حائل نہ ہونے دیں۔ اس لئے کہ یہ اجتماع تقریباً اتنا ہی اہم ہے جتنا اگست ۱۹۷۷ء میں منعقد ہونے والا وہ چھ روزہ اجتماع تھا جس میں تنظیم کے لئے "بیعت سمع و طاعت فی المعروف" کی اساس اختیار کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس سلسلے میں اس امر کا تذکرہ بھی غالباً نامناسب نہ ہو گا کہ خود میں امریکہ سے فوری طور پر اسی اجتماع کے لئے واپس آیا ہوں۔

چند روز قبل جبکہ بفضلہٖ تعالیٰ امید واثق ہو گئی کہ یہ اجتماع حسب منشا منعقد ہو ہی جائے گا تو میرے ذہن نے اس سے بھرپور استفادہ کے لئے ترتیب مباحث پر غور کیا تو میں حسب ذیل نتائج تک پہنچا ہوں :

۱ ۔ میرے بعد کے دور کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے سب سے پہلے ہمیں نظام بیعت پر بھرپور نظرثانی کر لینی چاہئے۔ تاکہ (i) اگر کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو تو اس کا فیصلہ کر لیا جائے۔ ورنہ (ii) اگر بعض حضرات کے ذہنوں میں کوئی اشکال ہوں تو وہ رفع ہو جائیں۔ اور ہم اسے نئے اور زیادہ بھرپور انشراح صدر کے ساتھ جاری رکھ سکیں۔

اس ضمن میں حسب ذیل دو باتیں میری جانب سے پیش نظر رہیں :

ایک یہ کہ اگرچہ میرے نزدیک اقامت دین کی جدوجہد کے لئے قائم ہونے والی

جماعت کے لئے واحد منصوص' مسنون اور ماثور اساس صرف بیعت ہی کی ہے' تاہم میں ہمیشہ سے یہ کہتا رہا ہوں کہ مغربی طرز کی دستوری تنظیم کو بھی میں حرام یا ممنوع نہیں بلکہ "مباح" سمجھتا ہوں۔

دوسرے یہ کہ نظام بیعت کے لئے کتاب و سنت اور سیرت و تاریخ سے مطابقت پر مستزاد جو عقلی استدلال ہے اس کا بھی ایک جزو تو مستقل اور ابدی ہے یعنی یہ کہ انقلابی جدوجہد کے آخری یعنی اقدامی مرحلے کے لئے اس طرز کا نظم قطعاً ناگزیر ہے اور اس کے لئے مناسب یہی ہے کہ طبائع کو پہلے ہی سے اس کا خوگر بنا دیا جائے---- لیکن ایک جزو صرف داعی اول اور موسس تنظیم کی ذات سے متعلق ہوتا ہے' یعنی یہ کہ کسی بھی دعوت و تحریک کا داعی ہی اس کے جملہ مضمرات اور مقدرات کو بہتر طور پر جانتا ہے اور چونکہ تنظیم اور جماعت کی پوری تعمیر میں ایک ایک اینٹ اسی کے ہاتھ کی رکھی ہوئی ہوتی ہے لہٰذا اس کی ذات میں "اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ" کا عکس اور "صاحبُ البیتِ اَدریٰ بما فیھا" کی کیفیت موجود ہوتی ہے' لیکن یہ دلیل اس کے بعد کسی دوسرے شخص کے حق میں موجود نہیں ہوتی اس لئے کہ وہ سب لوگ جو اس داعی کی دعوت پر جمع ہوتے ہیں اس اعتبار سے کم و بیش مساوی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ (یہی وجہ ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور میں بھی میں نے اپنے لئے تو "حق استرداد" (VETO) رکھا تھا' لیکن میرے بعد کسی صدر انجمن کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا۔)

بنابریں اس مسئلے پر غور کر لینے میں ہرگز کوئی حرج نہیں ہے!----!

اور یہ بھی از خود ظاہر ہے کہ اس مسئلے میں حتمی فیصلہ بھی ہمیں اس اجتماع ہی میں کر لینا ہوگا۔ اس لئے کہ مشاورت کی باقی پوری کارروائی کا دارومدار اسی پر ہے!

۲ ۔ اب اگر یہ طے ہو گیا کہ میرے بعد کے دور کے لئے بیعت کی اساس ترک کر کے دستوری نظام اختیار کر لیا جائے تب تو معاملہ ہی مختلف ہوگا اور ایک بالکل نئے دستور کی تدوین ضروری ہو جائے گی جس کے لئے ایک دستور ساز مجلس کا انتخاب تو اس موقع پر کیا جا سکتا ہے' اور کچھ رہنما اصول بھی طے کئے جا سکتے ہیں لیکن پورے دستور کی تدوین ظاہر ہے کہ اس اجتماع میں ممکن نہیں ہوگی۔ اور چونکہ اسے میرے بعد ہی نافذ العمل ہونا ہے لہٰذا فوری طور پر کوئی رکاوٹ بھی واقع نہیں

ہو گی۔

لیکن اگر نئے انشراح صدر کے ساتھ بیعت ہی کے نظام کو جاری رکھنے کا فیصلہ ہو تو پھر مجھے ذاتی طور پر دو مشورے درکار ہوں گے :

ایک یہ کہ آیا میں نظام العمل کی دفعہ ۲(ا) کے مطابق اپنا جانشین نامزد کر دوں یا اسے مجلس مشاورت ہی کے لئے رہنے دوں؟

اس معاملے میں چونکہ آخری اور حتمی فیصلہ رفقاء کی آراء کو "گننے" اور "تولنے" کے بعد خود مجھ ہی کو کرنا ہے لہٰذا اس کا بھی امکان ہے کہ میرا ذہن اجتماع کے دوران ہی یکسو اور کسی ایک رائے پر جازم ہو جائے اور میں اس کا اعلان بھی کر دوں ------ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے حتمی رائے قائم کرنے میں مزید وقت درکار ہو۔

اس پہلی بات کے ضمن میں ضمنی مشورہ یہ بھی درکار ہو گا کہ نامزدگی کی صورت میں میں اس کا اعلان اپنی زندگی ہی میں کر دوں یا اسے وصیت کی صورت میں لکھ کر رکھ دوں۔ (موخر الذکر صورت میں اس کا امکان رہے گا کہ میں اپنی "وصیت" پر نظر ثانی بھی کرتا رہوں!)

۳ ۔ بہر صورت -----اگر میں نے جانشین نامزد نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تب تو میں ذہناً بالکل فارغ ہو جاؤں گا۔ اور سارا معاملہ اصلاً اور بالفعل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں اور عملاً اور ظاہراً مجلس مشاورت کے حوالے رہے گا۔

لیکن اگر میں نے (i) جانشین نامزد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یا (ii) اگر ابھی میں مذبذب رہا ---- تو چونکہ اس قسم کے اجتماع روز روز منعقد نہیں کئے جا سکتے' لہٰذا میں دونوں صورتوں میں ہر ملتزم رفیق سے یہ دوسری رائے بھی اسی موقع پر حاصل کر لینا چاہتا ہوں کہ اگر میں جانشین نامزد کرنے کا فیصلہ کروں تو آپ کی رائے میں کون اس کا اہل ہے؟ اس کے لئے مناسب مفصل طریق کار اجتماع سے قبل وضع کر لیا جائے گا۔

۴ ۔ جانشینی کے مسئلے سے قطع نظر بھی' اپنی عمر اور صحت' اور بیرون ملک بالخصوص امریکہ کی مصروفیت کے پیش نظر میرا یہ فیصلہ ہے کہ نظام العمل کی دفعہ ا

(ج) کے مطابق ایک مستقل نائب امیر نامزد کردوں جو ---(i) پوری تنظیم کے لئے بھی ہو سکتا ہے' اور --- (ii) صرف پاکستان کے لئے بھی! اس سلسلے میں بھی میں رفقاء کی آراء سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔

فقط والسلام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

21-3-95

اس خط سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس اجتماع کا اصل محرک یہ بنا کہ امیر محترم اپنے بعد تنظیم کی امارت جیسے اہم اور نازک مسئلے پر رفقاء تنظیم سے مشورہ چاہتے تھے۔ تاہم بعض دیگر امور کو بھی اس مشاورت کے ایجنڈا میں شامل کیا گیا جن میں اہم ترین بلکہ مقدم ترین یہ تھا کہ آئندہ تنظیم کا نظم کیا ہو! آیا امیر محترم کے بعد بھی بیعت کے نظام کو ہی برقرار رکھا جائے یا مغربی طرز کی دستوری تنظیم کی صورت میں اسے چلایا جائے۔ اس مسئلے پر رفقاء کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ تنظیم کے موجودہ طریق کار اور بالخصوص طریق تنظیم پر از سر نو غور کر کے کھلے ذہن کے ساتھ اپنی رائے دیں تاکہ ہم جس نتیجے پر بھی پہنچیں اس پر انشراحِ صدر کے ساتھ آگے بڑھ سکیں۔ بعض بالکل ذاتی اور نجی معاملات پر بھی امیر محترم نے رفقاء سے رائے لی' جن کا تذکرہ یہاں غیر ضروری ہے۔

بیعت کی بنیاد پر استوار ہونے والی تنظیم کا یہ مشاورتی اجتماع بلاشبہ نظام بیعت کی برکات کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ جو لوگ اس اجتماع میں شریک تھے وہ جانتے ہیں کہ ایک عجیب جذباتی کیفیت اور وارفتگی تمام رفقاء پر طاری تھی۔ یہ احساس کہ ہماری تنظیم کے امیر ہم سے اہم تنظیمی امور میں مشورہ چاہتے ہیں' امیر اور مامورین کے دو طرفہ اعتماد اور باہم قلبی و ذہنی وابستگی میں بے پناہ اضافے کا موجب بنا۔ رفقاء کا شوق و اشتیاق اور دلچسپی و انہماک دیدنی تھا۔ بغیر کسی تنبیہہ کے اور بغیر اس کے کہ منتظمین کی جانب سے کوئی سخت لب و لہجہ اختیار کرنے کی نوبت آئی ہو' اس اجتماع کے تمام پروگراموں میں رفقاء کی جانب سے ڈسپلن اور نظم و ضبط کا مثالی مظاہرہ ناقابل یقین حد تک قابل رشک تھا۔ ہر ISSUE پر رفقاء کی رائے جاننے کے لئے پہلے سے تیار شدہ سوالنامے پر ہر رفیق سے الگ الگ رائے

لی جاتی تھی۔ ایسے مواقع پر اجتماع گاہ ایک نہایت منظم پولنگ اسٹیشن کا نقشہ پیش کرتی۔ لیکن یہ عجیب پول تھا کہ جس میں رائے دینے والا ہر شخص شعوری طور پر یہ جانتا تھا کہ اس کی رائے کی حیثیت محض مشورے کی ہے' ان امور پر حتمی فیصلہ امیر تنظیم کو کرنا ہے' ووٹوں کی گنتی سے فیصلہ نہیں ہونا۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود بھی وہاں کسی منفی تاثر کا شائبہ تک نہ تھا۔ بلکہ اس کا نقد مثبت فائدہ یہ محسوس ہوا کہ نہ کسی Issue پر کنویسنگ کی نوبت آئی' نہ کسی قسم کی لابنگ کا وہاں مشاہدہ ہوا' بلکہ نہایت پر سکون اور باہمی اعتماد کے جذبے سے معمور ماحول میں ہر رفیق نے اپنی آزادانہ رائے پوری دیانت داری کے ساتھ تحریر کی۔ چنانچہ رائے دینے کے بعد ہر رفیق گویا ایک اہم دینی ذمہ داری سے سبکدوشی کے احساس سے شاد کام نظر آتا تھا۔ اس اجتماع کے دوران متعدد بار رفقاء سے مختلف معاملات پر تحریری رائے لی گئی اور بعض امور پر فیصلہ اسی اجتماع میں سنا بھی دیا گیا' لیکن ایک لمحے کے لئے بھی کسی ہڑبونگ اور افراتفری کا نقشہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ سچی بات ہے کہ اس دور میں جبکہ ہر سطح پر انتشار' افراتفری اور خود سری کا دور دورہ ہے' ایسا اجتماع ایک معجزے سے کم معلوم نہیں ہوتا۔ اور یہ اعجاز ہے نظام بیعت کا۔۔۔!! جسے اختیار کر کے ایک سنت کو زندہ کرنے کی توفیق اللہ نے ہمیں بخشی ہے۔ فللّٰہ الحمد والمنّة

رفقاء تنظیم اور قارئین میثاق کی دلچسپی کے پیش نظر اہم مشورہ طلب امور کے ضمن میں رفقاء کی جانب سے موصول ہونے والی آراء کا ایک مختصر جائزہ ہم سطور ذیل میں درج کئے دے رہے ہیں۔

مشورہ طلب امور میں سے پہلا مسئلہ تنظیم کی ہیئت اجتماعیت کے حوالے سے تھا۔ اس ضمن میں جو رائے نامہ رفقاء میں تقسیم کیا گیا اس میں دو متبادل صورتیں بیان کر کے رفقاء کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ان میں سے کسی ایک کے حق میں رائے دیں۔ وہ دو متبادل صورتیں حسب ذیل تھیں!

۱۔ آئندہ تنظیم کا نظم بیعت سمع و طاعت فی المعروف کی بنیاد پر ہی ہو!

۲۔ بیعت کی بجائے کسی دستوری نظم کی بنیاد پر ہو!

اجتماع کے اس سیشن میں موجود ۳۱۰ رفقاء میں سے بہت بھاری اکثریت' یعنی ۲۸۴

رفقاء نے اول الذکر کے حق میں فیصلہ دیا۔ صرف ۱۹ رفقاء کی رائے یہ سامنے آئی کہ آئندہ تنظیم کو بیعت کی بجائے کسی دستوری نظم پر استوار کیا جانا چاہئے' جبکہ ۷ رفقاء نے کسی رائے تک نہ پہنچنے کے باعث سوالنامہ خالی واپس لوٹایا۔ مشاورت سے متعلق بقیہ تمام امور چونکہ اسی اہم مسئلے پر موقوف تھے کہ آئندہ نظم جماعت حسب سابق بیعت کی بنیاد پر استوار رہے یا مغربی طرز کا دستوری نظام اختیار کیا جائے' لہٰذا رفقاء کی رائے سامنے آنے کے بعد اور یہ دیکھنے کے بعد کہ نوے فیصد سے زائد رفقاء نے نظام بیعت کے حق میں رائے دی ہے' امیر محترم نے اسی سیشن میں یہ فیصلہ سنا دیا کہ ان کے بعد بھی تنظیم اسلامی بیعت کی مسنون اساس ہی پر استوار رہے گی۔ یہ چونکہ قریباً تمام رفقاء کا متفقہ فیصلہ تھا لہٰذا اس موقع پر تمام شرکاء نے نظام بیعت پر مزید اطمینان اور انشراح صدر محسوس کیا۔ نظام بیعت کے حق میں امیر محترم کے اس اعلان کے بعد دیگر امور بحث کے لئے Open کئے گئے۔

دوسرا مشورہ طلب معاملہ آئندہ کے لئے کسی جانشین کی نامزدگی سے متعلق تھا۔ درحقیقت یہی وہ سب سے زیادہ اہم اور نازک مسئلہ تھا جو اس مشاورتی اجتماع کے انعقاد کا محرک بنا۔ اس ضمن میں درج ذیل متعین سوالات کے حوالے سے رفقاء سے رائے طلب کی گئی :

(ا) کیا امیر محترم کو اپنا جانشین اپنی زندگی ہی میں نامزد کر دینا چاہئے؟

(ب) جانشین نامزد کرنے کی صورت میں کیا امیر محترم اس کا اعلان اپنی زندگی ہی میں کر دیں یا اپنے فیصلے کو وصیت کی شکل میں محفوظ کر دیں؟

(ج) جانشین کی نامزدگی کی صورت میں آپ کی رائے میں اولین ترجیح کون ہے؟

اجتماع کے اس سیشن میں شریک ۳۱۳ رفقاء میں سے ایک عظیم اکثریت' یعنی ۲۸۴ رفقاء نے پہلے سوال کے جواب میں یہ رائے ظاہر کی کہ امیر محترم کو اپنا جانشین اپنی زندگی ہی میں نامزد کر دینا چاہئے۔ ۲۷ رفقاء نے اس کے خلاف رائے دی' جبکہ ۵ رفقاء نے کسی رائے تک پہنچنے سے عجز کا اظہار کیا۔ یہاں بھی گویا نوے فیصد سے زائد رفقاء ایک رائے پر متفق نظر آتے ہیں۔ تاہم اس مسئلے سے متعلق دوسرے سوال کے جواب میں رفقاء واضح طور پر دو حصوں میں بٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۶۷ رفقاء کی رائے یہ تھی کہ اپنے

جانشین کا اعلان امیر محترم کو اپنی زندگی ہی میں کر دینا چاہئے۔ اس کے مقابلے میں ۱۰۷ رفقاء نے یہ رائے ظاہر کی کہ جانشین کے نام کا اعلان کرنے کی بجائے اس کے بارے میں اپنے فیصلے کو وصیت کی شکل میں محفوظ کر دینا زیادہ مناسب ہو گا۔ ۳۹ رفقاء اس معاملے میں کسی بھی رائے یا نتیجے تک پہنچنے سے قاصر رہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ "آپ کی رائے میں جانشینی کے سب زیادہ اہل کون ہیں اور ان میں آپ کی اولین ترجیح کون سی ہے؟" رفقاء نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق کئی نام تجویز کئے۔ یہاں ہم ان چار رفقاء کے نام درج کر رہے ہیں جن کے حق میں سب سے زیادہ رفقاء نے رائے ظاہر کی ہے۔ ان چار رفقاء کے نام حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے یہ ہیں: رحمت اللہ بٹر صاحب' ڈاکٹر عبدالخالق صاحب' ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب اور مختار حسین فاروقی صاحب

مشورہ طلب امور میں سے تیسرا مسئلہ نائب امیر کی تقرری سے متعلق تھا۔ قبل ازیں امیر محترم' رفقاء کے نام اپنے مراسلے میں اپنے اس فیصلے کا اظہار فرما چکے تھے کہ انہیں نظام العمل کی دفعہ ۱(ج) کے مطابق آئندہ کے لئے ایک مستقل نائب امیر کا تقرر کرنا ہے۔ اور یہ کہ نائب امیر کے انتخاب کے لئے بھی انہیں رفقاء کا مشورہ درکار ہو گا۔ اس ضمن میں رفقاء کی رائے معلوم کرنے سے قبل اس مشاورتی اجتماع میں امیر تنظیم نے واضح طور پر رفقاء کو بتایا کہ جانشینی کا مسئلہ قطعی طور پر نائب امیر کی تقرری کے مسئلے سے مختلف ہے' لہٰذا ان دو امور کو باہم گڈمڈ نہ کیا جائے۔ انہوں نے واضح کیا کہ نائب امیر کو ان کی زندگی میں ان کے زیر ہدایت اور زیر نگرانی کام کرنا ہے جبکہ جانشین کے طور پر جس رفیق تنظیم کا انتخاب وہ کریں گے اسے بغیر کسی ظاہری سہارے کے پوری تنظیم کی ذمہ داری کو تنہا اٹھانا ہو گا' لہٰذا ضروری نہیں کہ جو شخص نائب امیر کے طور پر کامیابی کے ساتھ کام کر سکتا ہو وہ جانشینی کا اہل بھی ہو' اسی طرح اس بات کا بھی پورا امکان موجود ہے کہ ایک شخص جو جانشین کے طور پر موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہو وہ نائب امیر کے منصب کے لئے موزوں نہ ہو۔ امیر محترم نے تاکید اً کہا کہ اس فرق کو پورے طور پر ملحوظ رکھ کر رفقاء کو اس معاملے میں اپنی رائے دینا چاہئے۔

چنانچہ اس ضمن میں اس سوال کے جواب میں کہ "نائب امیر کے لئے آپ کسے اپنی

ترجیح اول قرار دیں گے؟" رفقاء نے جو نام تجویز کئے ان میں سے چوٹی کے چار نام حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے اس طرح ہیں : رحمت اللہ بٹر صاحب' ڈاکٹر عبدالخالق صاحب' جنرل محمد حسین انصاری صاحب اور مختار حسین فاروقی صاحب۔

نائب امیر کے تقرر کے ضمن میں رفقاء کی رائے جاننے کے لئے جو سوال نامہ تقسیم کیا گیا تھا اس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ آیا نائب امیر کا تقرر صرف پاکستان کے لئے ہونا چاہئے یا پوری تنظیم کے لئے' جس میں بیرون پاکستان تنظیم کے تمام مراکز بھی شامل سمجھے جائیں؟--- اس معاملے میں بھی رفقاء کی رائے واضح طور پر دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اجتماع گاہ میں موجود ۳۲۱ رفقاء میں سے ۱۱۰ کی رائے یہ تھی کہ یہ تقرری صرف پاکستان کے لئے ہونی چاہئے جبکہ ۱۹۸ رفقاء نے یہ رائے دی کہ تقرری پوری تنظیم کے لئے کی جانی چاہئے۔ ۱۳ رفقاء یہاں بھی کسی معین رائے تک پہنچنے سے قاصر رہے۔

چونکہ یہ بات پہلے سے طے تھی کہ نائب امیر کا تقرر فوری طور پر کرنا ہے لہٰذا امیر محترم نے اس ضمن میں اسی اجتماع میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کو نائب امیر نامزد کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور اس امر کا اعلان بھی کیا کہ یہ تقرری صرف تنظیم اسلامی پاکستان کے لئے ہے۔ اس طرح مشورہ طلب امور میں سے دو اہم معاملات پر فیصلہ تو اسی اجتماع میں رفقاء کے سامنے آگیا' صرف جانشینی کے مسئلے پر امیر محترم نے اپنے فیصلے کو محفوظ رکھا ہے اور کسی حتمی فیصلے کا اعلان تاحال نہیں کیا' تاہم اس ضمن میں اب انہیں پورا اطمینان ہے کہ رفقاء کی قیمتی آراء کی روشنی میں انہیں اب کسی فیصلے تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوگی۔ وہ اس بات پر بھی بہت مطمئن اور خوش ہیں کہ مشاورت کا یہ سارا عمل بحمد اللہ نہایت حسن و خوبی کے ساتھ سرانجام پایا ہے' اور ادھر کچھ عرصے سے "اپنے بعد" کی جو فکر ان کے اعصاب پر سوار تھی' وہ اس مشاورتی اجتماع کے بعد اب بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ فللّٰہ الحمد۔

رفقاء و احباب جانتے ہیں کہ امیر تنظیم پر یہ اللہ کا خصوصی فضل ہوا کہ اس نے انہیں اپنے کلام اور اپنے دین کی خدمت کے لئے پسند فرمالیا۔ "الہدیٰ" یعنی قرآن حکیم کے تعلیم و تعلم کے لئے درس و تدریس اور "دین حق" کے غلبہ و اقامت کے لئے

جدوجہد' یہ دو کام طالب علمی کے دور ہی سے ان کے لئے مقصدِ حیات کا درجہ اختیار کر چکے تھے۔ ان کی تمام صلاحیتیں اور اوقات بحمد اللہ اسی کام میں صرف ہوئے اور اللہ کی تائید و توفیق سے' اب بھی ہو رہے ہیں۔ رفقاء اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ گزشتہ چند برسوں سے' بالخصوص جب امیر محترم کی عمر قمری تقویم کے اعتبار سے ۶۳ برس ہوئی' یہ احساس ان پر غالب ہے کہ وہ مسنون عمر پوری کر چکے ہیں اور جو کام اللہ کو ان سے لینا تھا جیسا کچھ بھی ان سے بن پڑا' اسی کی توفیق سے' وہ سرانجام دے چکے ہیں۔ اب خواہ تنظیم اسلامی کا معاملہ ہو کہ جو غلبہ و اقامت دین کی خاطر تشکیل دی گئی ہے' یا مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا' کہ جس کے پیش نظر تعلیم و تعلّم قرآن کا گرانقدر کام ہے' زیادہ فکر انہیں اپنے بعد کی ہے۔ چنانچہ گزشتہ دو برسوں کے دوران امیر محترم کی زیادہ توجہ اس بات پر رہی کہ تنظیم اسلامی کے نظام العمل اور مرکزی انجمن کے دستور میں کوئی ایسا خلا نہ رہ جائے کہ جو ان کے بعد کسی بحران کو پیدا کرنے کا موجب بنے۔ اسی احساس کے پیش نظر امیر محترم نے اس سال روزہ مشاورتی اجتماع کے انعقاد کا فیصلہ کیا' اور مرکزی انجمن کی سطح پر اس احساس کا یہ مظہر سامنے آیا کہ گزشتہ سال مرکزی انجمن کی ہیئت انتظامیہ کی تشکیل نو کی گئی اور صدر مؤسس کے بعد کی صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے دستور میں مناسب حک و اضافہ بھی کیا گیا۔ چنانچہ حال ہی میں منعقد ہونے والے انجمن کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ترمیم شدہ دستور چھاپ کر اراکین میں تقسیم کیا گیا ہے جس کے لئے "تقدیم" امیر محترم نے ابھی دو ہفتے پیشتر ہی تحریر کی ہے۔ اس "تقدیم" کے بین السطور بھی ان کا یہ شدتِ احساس چھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کا تذکرہ سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ زیر نظر شمارے میں امیر تنظیم کی یہ تحریر بھی ہدیہ قارئین کی جا رہی ہے تاکہ نہ صرف یہ کہ وہ امیر محترم کے احساسات میں شریک ہو سکیں بلکہ آج سے ۲۳ برس پہلے قائم ہونے والے ادارے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی اب تک کی تاریخ اور اس کے قیام کے مقاصد و پس منظر کا اجمالی خاکہ بھی قارئین کے سامنے آجائے۔ OO

ملکی وبین الاقوامی حالات پر تبصرہ

امیر تنظیم اسلامی کے خطبات جمعہ کے پریس ریلیز

○

پختونستان کے نام سے نئے صوبے کا مطالبہ نہ کفر ہے نہ جرم

پاکستان امریکہ کا پٹھو بن کر ایک نیا "اسرائیل" بننے والا ہے

لاہور (پ ر) ۲۱/ اپریل۔ پاکستان اندرونی اور بیرونی طور پر سخت مشکلات سے دوچار ہے اور حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ایران اور چین جیسے قریبی اور دوست ممالک سے دور ہو رہا ہے۔ ایران کے صدر کی جانب سے بھارت' ایران اور چین پر مشتمل بلاک کے قیام کی تجویز جس کا واضح ثبوت ہے۔ قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور میں نماز جمعہ سے قبل خطاب کرتے ہوئے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ پاکستان امریکہ کا آلہ کار بن کر ایران کے گھیراؤ میں شامل ہوا تو اسے زبردست خانہ جنگی کا سامنا کرنا پڑے گا جس سے پاکستان دوسرا لبنان بن جائے گا۔ امریکہ کی اب کشمیر کی آزاد ریاست کے قیام یا پاکستان سے کراچی کی علیحدگی میں کوئی زیادہ دلچسپی باقی نہیں رہی کہ اس وقت پورا پاکستان ہی امریکہ کی جھولی میں گر چکا ہے۔

انہوں نے کہا اس وقت دنیا میں دو اسرائیل قائم ہو چکے ہیں جن میں سے ایک یہودی اسرائیل اور دوسرا "عربی اسرائیل" ہے۔ امریکہ کے وفادار عرب ممالک نئے اسرائیل کی شکل اختیار کر چکے ہیں جب کہ پاکستان امریکہ کا پٹھو بن کر تیسرا اسرائیل بننے والا ہے۔ امریکہ چکوال میں قائم سیسمک (siesmic) سنٹر کے ذریعے پاکستان سمیت چین اور علاقے کے دیگر ممالک کی ایٹمی سرگرمیاں مانیٹر کرے گا۔ امریکہ خود یہودیوں کا آلہ کار ہے اور وہ ان کی قابل اعتماد سواری بن چکا ہے۔ امریکہ اگرچہ دنیا کی واحد عالمی طاقت کہلاتا ہے مگر وہ دنیا کا سب سے بڑا مقروض ملک ہے' جسے یہودی بینکار و سرمایہ دار جب چاہیں تباہی سے دوچار کر سکتے ہیں۔

ملکی صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ حالات کی سنگینی اب تو اندھوں کو بھی نظر آ رہی ہے۔ سندھ میں علیحدگی پسندی کی تحریکیں اس وقت اگرچہ ظاہری طور پر دبی ہوئی نظر آتی ہیں مگر عملاً وہ پوری طرح موجود ہیں اور پیپلز پارٹی کی صوبائی اور مرکزی حکومت سندھیوں کے مقاصد کو پورا کر رہی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پاکستان کا قیام اگر کوئی جرم تھا تو اس کا خمیازہ اہل سندھ خصوصاً کراچی کے لوگوں کو سب سے پہلے بھگتنا ہو گا' جن کی واضح حمایت و تائید پاکستان کے قیام کے حق میں تھی۔ موجودہ تباہی و فساد کی بنیادی وجہ قیام پاکستان کے مقاصد سے انحراف ہے' جس کی سزا سے ہم دوچار ہیں۔

اجمل خٹک کی طرف سے پختونستان کے مطالبے کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ یہ نعرہ "باسی کڑی میں ابال" کے مترادف ہے۔ اجمل خٹک جس پختونستان کی بات کر رہے ہیں' وہ پاکستان کا حصہ نہیں ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ اقوام متحدہ کے نمائندے محمود مسطری ظاہر شاہ کے حامیوں کو اقتدار میں لانا چاہتے ہیں۔ اس منصوبے میں ناکامی کے بعد افغانستان کو تقسیم کرنے کی سازش کی جائے گی جس سے آزاد پختونستان کے قیام کی راہ ہموار ہو جائے گی' جس کا راگ اجمل خٹک الاپ رہے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے اس مطالبے کو دہراتے ہوئے کہا کہ ملک کی سلامتی کے لئے نئے صوبوں کا قیام ناگزیر ہے۔ بلوچستان کے نام سے ایک صوبہ موجود ہے۔ اس طرح پختون لوگوں کے لئے پختونستان کے نام سے نئے صوبے کا مطالبہ نہ کفر ہے اور نہ جرم۔ سندھ سمیت پنجاب کے نئے صوبوں کی تشکیل بھی ضروری ہے۔

اسلامی ریاست کے قیام کے بغیر عبادت و شہادت کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے

کشمیر کا مسئلہ چین اور ایران جیسے دوست ممالک کے تعاون سے حل کیا جانا چاہئے

لاہور (پ ر) ۱۴/ اپریل۔ اسلام کا عادلانہ نظام ہی معاشرے کے تمام تقاضے پورے کر سکتا ہے مگر اس وقت پوری دنیا پر باطل نظام مسلط ہے جس کی وجہ سے انسانوں کی عظیم اکثریت جانوروں کی سطح پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ انسانوں کی بہت بڑی تعداد شدید محنت کرنے

کے باوجود بنیادی ضروریات زندگی سے بھی محروم ہے۔ان حالات میں اللہ کی بندگی کا حق ادا کرنا عملاً ناممکن ہے' جو انسان کا مقصد زندگی ہے۔مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں نماز جمعہ سے قبل خطاب کرتے ہوئے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ عادلانہ نظام کے قیام کے بغیر لوگوں کی اکثریت دنیا میں اپنے مثالی کردار کا مظاہرہ نہیں کر سکتی۔استحصالی نظام میں مذہب دولت مندوں کے لئے وقت گزاری کا مشغلہ اور ذہنی عیاشی بن کر رہ جاتا ہے۔ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اللہ کی بندگی اور رسول ﷺ کی کامل اطاعت کا نام ہی دین ہے۔ایک مسلمان اصلاً اللہ کی اطاعت کرتا ہے مگر عملی اعتبار سے رسول کی اطاعت ہی میں پورا دین سمٹ کر آجاتا ہے کیونکہ یہی اللہ کا حکم ہے۔اس حوالے سے ایک مسلمان کے لئے نبی اکرم ﷺ کی ذات سب سے بڑھ کر محبوب بن جاتی ہے' جس کے حوالے سے ہی بندۂ مومن کا جذبہ جہاد باطل نظام کے خلاف نقطہ عروج کو پہنچتا ہے۔امیر تنظیم اسلامی نے کہا اسلامی ریاست کے قیام کے بغیر "عبادت" اور "شہادت" کا تقاضا پورا نہیں ہو سکتا۔رسول اکرم ﷺ نے اپنے قول و عمل کے ذریعے نمونہ و مثال بن کر اسلام کی سچائی کی شہادت دی۔ختم نبوت کے بعد پوری دنیا کے سامنے اسلام کی گواہی دین کو عملی طور پر رائج کر کے ہی دی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کا دورۂ امریکہ انتہائی ناکام ثابت ہوا ہے۔"زیرو" کامیابی حاصل کرنے کے کارنامے پر بے نظیر کے استقبال کی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔انہوں نے کہا کہ بے نظیر بھٹو نے پاکستان کو امریکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔بے نظیر نے امریکہ کے آگے گھٹنے ٹیک کر نہ صرف قومی سلامتی کو داؤ پر لگا دیا ہے بلکہ انہوں نے قومی غیرت و حمیت کا جنازہ بھی نکال دیا ہے۔ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا بے نظیر نے امریکہ سے بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے خلاف مدد طلب کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر کی ثالثی کی "عاجزانہ" درخواست بھی کی ہے۔انہوں نے خبردار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر کشمیر کی ثالثی امریکہ یا برطانیہ کے سپرد کر دی گئی تو علاقے میں ایک "نیا اسرائیل" قائم ہو جائے گا' جو امریکی استعمار کے اڈے کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

امیر تنظیم اسلامی نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ امریکہ کے آگے جھکنے کی بجائے ایران اور چین جیسے دوست ملکوں کے تعاون سے مسئلہ کشمیر کے حل کی کوشش کرے۔مسئلہ کشمیر کے

حل کے لئے بھارت سے دو طرفہ مذاکرات کا آغاز کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ بے نظیر کے والد ذوالفقار علی بھٹو نے بھارت کے ساتھ شملہ معاہدہ کیا تھا جو مذاکرات کی بنیاد بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہمیں نیو ورلڈ آرڈر کا آلہ کار بننے کی بجائے علاقے کے دوست ممالک کا ایک مضبوط اقتصادی بلاک بنانے کی کوشش کرنی چاہئے جس میں ایران' افغانستان' پاکستان اور وسطی ایشیا کی مسلمان ریاستیں شامل ہوں۔ انہوں نے کہا ملک کی سلامتی کے خاتمے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ حکومت پاکستان امریکہ کو مطلوب ایک مبینہ ملزم کو امریکہ کے حوالے کر کے فخر کا اظہار کر رہی ہے۔ دوسری جانب اسلامی ملک لیبیا کا کردار بھی ہے جو ہم سے کئی گنا چھوٹا ملک ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے باشندوں کو امریکہ کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ کرنل قذافی امریکہ کی تمام تر پابندیوں اور دھمکیوں کو برداشت کر کے قومی غیرت و حمیت کا ثبوت فراہم کر رہا ہے۔

کراچی کے حالات کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا الطاف حسین اگر واقعی مجرم ہے تو اسے واپس بلا کر مذاکرات کر کے ایک کروڑ سے زائد لوگوں کی سیاسی محرومی کا ازالہ کیا جائے۔ جیسے مجیب الرحمٰن کے چھ نکات تسلیم نہ کر کے پاکستان کو دولخت کرانا منظور کر لیا گیا تھا ویسے ہی آج کراچی کے ساتھ تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔ کراچی سمیت ملک کے نئے صوبے بنا کر ہی یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ حکومتی تشدد اگر ایک الطاف حسین کو کچلے گا تو دس نئے الطاف پیدا ہو جائیں گے۔

ان شاء اللہ العزیز' تنظیم اسلامی کے تحت آئندہ

ملتزم تربیت گاہ

۱۹ تا ۲۵ مئی ۱۹۹۵ء

بمقام مرکزی دفتر تنظیم اسلامی' ۶۷۔ علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو' لاہور

منعقد ہو گی۔

تنظیمِ اسلامی کی دعوت

۲۵/ دسمبر ۱۹۹۴ء کو تنظیم اسلامی حلقہ لاہور کے زیر اہتمام ایک دعوتی اجتماع میں امیر تنظیم اسلامی کا فکر انگیز خطاب

خطبۂ مسنونہ کے بعد :

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیمِ ۝
قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِىۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ‌ ؔ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ
اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىۡ‌ ؕ وَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝
صدق اللّٰہ العظیم

معزز حضرات اور محترم خواتین!

اِس وقت جو حضرات یہاں جمع ہیں ان میں دو قسم کے لوگ شامل ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو پہلے سے تنظیم اسلامی کے قافلے میں شریک ہیں اور دوسرے وہ حضرات ہیں جنہیں تنظیم اسلامی میں پہلے سے شامل افراد نے اپنے احباب اور اعزّہ و اقارب میں سے خصوصی دعوت دے کر یہاں بلایا ہے تاکہ ان کے سامنے تنظیم کا پیغام رکھا جاسکے اور اس طرح ان کو تنظیم میں شمولیت کی دعوت دی جائے۔ ظاہر بات ہے کہ اِس وقت میرے اصل مخاطَب دوسری قسم کے حضرات ہیں۔ جو حضرات پہلے سے تنظیم میں شامل ہیں وہ تو کسی نہ کسی درجے میں تنظیم اسلامی کے پیغام' اس کی دعوت' اس کے پروگرام اور اس کے اغراض و مقاصد سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ متفق ہیں اور اس حد تک متفق ہیں کہ انہوں نے اپنے وقت' اپنی صلاحیتوں' اپنے وسائل اور اپنی توانائیوں کا کچھ حصہ اس کے لئے وقف کیا ہے۔ اگرچہ شعور کے مختلف درجے اور فہم کے مختلف مراحل ہیں' چنانچہ کسی کے سامنے یہ بات بہت واضح ہے اور کسی کے سامنے اس کا نقشہ اجمالاً موجود ہے' لیکن بہرحال وہ سب

حضرات اس سے کسی نہ کسی درجے میں واقف ہیں۔ لہٰذا اِس وقت میرا اصل خطاب ان سے نہیں ہے' بلکہ میرا روئے سخن ان حضرات کی طرف ہے کہ جنہیں آج خاص طور پر دعوت دی گئی ہے اور وہ یہاں اس لئے تشریف لائے ہیں کہ سمجھیں کہ تنظیم اسلامی کیا ہے' اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں' اور اس کا طریقہ کار کیا ہے' تاکہ اگر ان کے دل و دماغ گواہی دیں کہ بات صحیح ہے تو وہ اس میں شمولیت کا فیصلہ کریں۔ تنظیم میں پہلے سے شامل حضرات کے لئے یہ ایک طرح کی تذکیر اور یاددہانی ہوگی۔

امیرِ تنظیم کا ذہنی و فکری پس منظر

تنظیم اسلامی اس اعتبار سے ایک بالکل منفرد قسم کی تنظیم ہے کہ اس میں شمولیت کا ذریعہ ایک شخص (امیر تنظیم) سے بیعت ہے اور اس بنیاد پر غالباً کوئی دوسری جماعت یا تنظیم اِس وقت کم از کم پاکستان میں موجود نہیں۔ اس حوالے سے چونکہ اس تنظیم میں شمولیت کا راستہ ذاتی طور پر مجھ سے بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف میں منسلک ہونے کا راستہ ہے' لہٰذا مجھے اپنی گفتگو میں یہ ترتیب قائم کرنی پڑی ہے کہ پہلے میں آپ حضرات کو یہ بتلاؤں کہ ذاتی طور پر میرا وہ کیا ذہنی و فکری پس منظر ہے اور ذاتی طور پر میرے لئے وہ کیا محرکات تھے جن کے تحت میں نے یہ تنظیم قائم کی۔ پہلی بات کے ضمن میں صرف دو باتیں کفایت کریں گی۔ اگرچہ انسانی زندگی ایک بڑا طویل عمل ہے' بقول علامہ اقبالؔ۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی!

تاہم عام طور پر جسے ہم "زندگی" کہتے ہیں' یعنی دنیوی زندگی' اس کا تریسٹھواں برس بھی اب قریب الاختتام ہے۔ اس طویل عرصے کے دوران میں نے بہت کچھ پڑھا بھی ہے' سنا بھی ہے اور غور و فکر بھی کیا ہے۔ نیز مختلف اَطراف و جوانب سے ذہن و فکر اور شعور پر اثرات بھی وارد ہوئے ہیں۔ اس کی تفصیل تو ظاہر ہے اِس وقت بیان نہیں کی جا سکتی' لیکن مختصراً میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری فکر' میری سوچ اور میرے نقطۂ نظر کے متعین ہونے میں دو اہم ترین عوامل تھے۔ بالکل اوائل عمر یعنی بچپن ہی میں میں جس چیز سے سب سے

زیادہ متاثر ہوا تھا وہ علامہ اقبال کی ملّی شاعری تھی۔ یوں سمجھئے کہ یہ چالیس کی دہائی کے ابتدائی سال تھے' جبکہ میری پیدائش ۱۹۳۲ء کی ہے۔ میں اپنی پانچویں جماعت ہی کے زمانے سے "بانگِ درا" پڑھتا رہا ہوں اور اس میں جو ایک ملی جذبہ ہے اس نے میرے قلب و ذہن پر گہرے اثرات مترتب کئے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب اُمّتِ مسلمہ اپنے زوال کی انتہا کو پہنچ چکی تھی' اُس وقت پوری دنیا میں تمام مسلمان ممالک غلام بنائے جا چکے تھے' عظیم سلطنتِ عثمانیہ کو ختم ہوئے ربع صدی کے قریب بیت چکی تھی' خلافت کا خاتمہ ہوئے سترہ اٹھارہ برس بیت چکے تھے اور اِس طرح پوری دنیا میں مسلمانوں کے ملّی اتحاد کا جو ایک نشان یا علامت تھی وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ اسی نقشہ کے پس منظر میں مولانا حالیؔ نے یہ اشعار کہے تھے۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اس مایوسی کی فضا میں علامہ اقبال نے ملتِ اسلامیہ کو ایک امید افزا پیغام دیا۔

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ ؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا!
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

اور۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا' عدالت کا' شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

میں صرف مثال کے طور پر یہ چند اشعار آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ یہ وہ کیفیات اور

اثرات تھے جن میں میرا ابتدائی سکول کا ابتدائی زمانہ گزرا۔ یہی وجہ ہے کہ میں تحریک پاکستان' جو اُس وقت اپنے شباب اور عروج پر تھی' اس کے ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن میں شامل ہو کر کام کرتا رہا۔ ۱۹۴۷ء میں مَیں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اس کے فوراً بعد' محض استعارے کے طور پر نہیں بلکہ واقعتاً' آگ اور خون کے دریا عبور کر کے پاکستان حاضری ہوئی۔ ہم نے ۱۷۰ میل کا فاصلہ پیدل قافلہ کے ساتھ بیس دن میں طے کیا جن میں ہم ہر لحظہ زندگی کی نسبت موت سے زیادہ قریب تھے۔ بہرحال اللہ نے ہمیں ہمارے خوابوں کی سرزمین پاکستان میں پہنچا دیا۔

جس نعرہ کے تحت یہ ملک حاصل کیا گیا تھا اس کے لئے یہاں پر ایک عملی جِدّوجُہد کے لئے جماعت اسلامی سامنے آئی۔ مولانا مودودی اسلامی دستور کا مطالبہ لے کر سامنے آئے تو فطری طور پر اس کی طرف توجہ ہوئی۔ پھر اس کے بعد طالب علمی کا بقیہ سارا زمانہ' یعنی ایف ایس سی کے دو سال جو کہ گورنمنٹ کالج میں بسر ہوئے اور ایم بی بی ایس کے پانچ سال جو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں بیتے' اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ ایک فعال انداز میں گزرا۔ اس کے بعد جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔ چنانچہ میرے ذہن و فکر اور میری سوچ پر دوسری بڑی چھاپ مولانا مودودی کی ہے' جن کے فکر کے دو پہلو میرے سامنے بہت واضح ہو کر آئے۔ ان میں سے ایک بات اگرچہ علامہ اقبال کے کلام سے بھی واضح ہو چکی تھی لیکن علامہ اقبال کے کلام سے جو خاکہ بنتا تھا اس میں تفصیل کا رنگ مولانا مودودی کی کتابوں نے بھرا۔ اور وہ یہ کہ اسلام ایک مذہب نہیں ہے' دین ہے' یہ ایک مکمل نظامِ زندگی ہے' یہ اپنا غلبہ چاہتا ہے' یہ مغلوب ہونے کے لئے نہیں آیا' اَلحَقُّ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی عَلَیہ۔ حق کا تو یہ حق ہے کہ وہ غالب ہو' سربلند ہو' نہ یہ کہ وہ مغلوب اور پامال ہو۔ اس کے علاوہ دوسرا پہلو فرائضِ دینی کے حوالے سے سامنے آیا' یعنی فرائض دینی صرف نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ ہی نہیں ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر آگے بھی ہیں۔ اس طرح فرائض دینی کا ایک جامع تصور سامنے آیا۔ چنانچہ خود دین کا ایک ہمہ گیر تصور اور پھر فرائض دینی کا ایک جامع تصور' یہ دو چیزیں ہیں جو مولانا مودودی کی تصانیف سے میرے سامنے آئیں اور جس کا بحمداللہ آج بھی اقرار کر رہا ہوں۔ بعد میں مولانا

ابوالکلام آزاد اور بہت سے دیگر حضرات کی تحریریں بھی پڑھیں۔ پھر خود جس قدر قرآن حکیم کا مطالعہ کیا اس سے اس فکر میں مزید پختگی پیدا ہوئی' گہرائی و گیرائی میں اضافہ ہوا اور اس پر اعتماد و وثوق بڑھتا چلا گیا۔ لہٰذا میں نے جو کچھ بھی کام شروع کئے وہ درحقیقت اسی ذہنی و فکری پس منظر کے زیر اثر کئے۔

میرے اس ذہنی و فکری پس منظر کے اہم لینڈ مارکس بھی نوٹ کر لیجئے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آنا ہوا تھا' ۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میں منٹگمری (ساہیوال) چلا گیا تھا جہاں والدین مقیم تھے۔ ۱۹۶۵ء میں میں پھر اس عزم کے ساتھ واپس لاہور آیا کہ اب اپنے آپ کو اسی جدوجہد کے لئے ہمہ تن لگا دوں گا۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء سے لے کر ۱۹۷۲ء تک سات سال میں نے تن تنہا کام کیا ہے۔ اس عرصے کے پہلے پانچ سال تو کچھ جزوی اعتبار سے پریکٹس بھی کرتا رہا لیکن فروری ۱۹۷۱ء میں حج کے موقع پر میں نے پریکٹس کو بالکل تج دیا اور اپنے آپ کو ہمہ وقت ہمہ تن اپنے اس مشن کے لئے فارغ کر لیا۔ چنانچہ فروری ۱۹۷۱ء کے بعد سے آج تک میں نے اپنی کسی توانائی اور وقت کا کوئی حصہ دنیوی معاش کے لئے صَرف نہیں کیا' بلکہ میرے وقت کا ایک ایک لمحہ اور میری قوت و صلاحیت کا ایک ایک شمہ اسی مشن کے لئے صَرف ہوا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے' جس کا یہ قاعدہ اور قانون ہے کہ محنت کی جائے تو اس کے نتائج نکلتے ہیں' ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے تحت پہلے قرآن اکیڈمی قائم ہوئی' پھر یہ قرآن کالج بنا جس کے سر پر یہ قرآن آڈیٹوریم کا تاج رکھا ہوا ہے جس میں ہم اِس وقت بیٹھے ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم ہوئی۔ اس سے قبل اگست ۱۹۷۴ء میں میں نے ایک تقریر کی تھی جس میں تنظیم کے قیام کے فیصلے کا اعلان کیا تھا۔ یہ تقریر اب "عزمِ تنظیم" کے نام سے چھپی ہوئی موجود ہے' جو حضرات بھی تنظیم کے قیام کا پس منظر' جو میں نے ابھی مختصراً بیان کیا ہے' اس کو ذرا تفصیل میں جاننا چاہتے ہوں وہ میرے اس کتابچے کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ بہرحال میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ۱۹۷۱ء سے لے کر اب تک بحمد اللہ میرے وقت اور میری صلاحیت کا کوئی حصہ دنیا کمانے یا دنیا بنانے میں صرف نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے حال ہی میں اس ضمن میں ایک تحریر "حسابِ کم و بیش" کے نام سے کتابچے کی شکل میں لکھی

ہے۔ اپنے اس مشن کے آغاز اور تنظیم اسلامی کے قیام سے قبل میرے پاس اِس پوری دنیا میں واحد جائیداد کرشن نگر میں ایک مکان تھا۔ اسی کو بیچ کر میں نے ماڈل ٹاؤن میں ایک مکان بنایا ہے۔ اس کے علاوہ اس پوری دنیا میں نہ میری کوئی جائیداد ہے نہ کوئی بینک بیلنس ہے۔ ایک کرنٹ اکاؤنٹ ضرور ہے جس میں شاید چار پانچ ہزار روپے پڑے ہوں۔ نہ میرے پاس کوئی بانڈز ہیں' نہ میرا کسی فرم میں کوئی حصہ ہے' نہ میرے پاس کوئی شیئرز ہیں۔ میری کُل کائنات اِس زمین پر اس آسمان کے نیچے' جسے دنیوی اعتبار سے جائیداد کہا جاسکتا ہے یہی ایک مکان ہے اور وہ بھی میں اپنے بچوں کو دے چکا ہوں۔

تنظیم کے قیام کے محرکات

اب میں اپنے اسی پس منظر کے دوسرے پہلو کی طرف آرہا ہوں کہ یہ کام میں نے کیوں کیا ہے؟ اس ضمن میں' جیسا کہ ہمارے دین کا ایک عام اسلوب ہے کہ پہلے نفی اور پھر اثبات (لا الٰہ الّا اللّٰہ)' میں آپ کے سامنے اس کے منفی اور مثبت دونوں پہلو رکھ رہا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ اس سے میرے پیش نظر کسی درجے میں بھی سیاست کا کھیل ہرگز نہیں ہے۔ یہاں "سیاست" سے میری مراد مروّجہ معروف معنوں میں سیاست ہے' یعنی اقتدار کی کشاکش۔ اس لئے کہ الحمدللہ' اللہ نے مجھے اتنی سمجھ دی ہے کہ میں یہ جانتا ہوں کہ کم از کم اِس ملک میں کہ جس کا نام پاکستان ہے' یہ سیاست صرف جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کا مشغلہ ہے یا کسی درجہ میں سرمایہ داروں کا۔ چنانچہ جو شخص ان دونوں چیزوں سے محروم ہے' یعنی نہ وہ جاگیردار اور لینڈ لارڈ ہے نہ اس کے پاس بہت بڑا سرمایہ ہے ظاہر بات ہے کہ اُس کا اِس میدانِ سیاست میں آنا حماقت ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ کسی کا آلۂ کار بن جائے' کسی بڑے لیڈر کا کارکن بن جائے اور اس کے حوالے سے اپنی حیثیت کے مطابق کچھ مفادات حاصل کرلے۔ باقی ہمارے ملک کی سیاست میں اگر کسی درجے میں آگے بڑھنے کا امکان ہے تو صرف ان دو طبقات کے لئے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ یعنی یا تو جاگیردار ہو جسے بغیر محنت کے وافر مقدار میں دولت مل رہی ہو' لوگ کاشت کر رہے ہوں اور وہ کھا رہا ہو۔ یا پھر سرمایہ دار ہو۔ جیسے ہمارے نواز شریف صاحب کہتے

ہیں کہ ہم نے سود دیا ہے، ہم نے قرضے لئے ہیں اور یہ مل بنائے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ میں اس اعتبار سے چونکہ بالکل بَری ہوں لہٰذا اس کا کوئی امکان نہیں کہ سیاست کے میدان میں کوئی قدم رکھوں۔ میں صرف امرِ واقعہ کے بیان پر اکتفا نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس کی دلیل بھی دے رہا ہوں۔ اور امرِ واقعہ بھی سامنے ہے کہ اب میری زندگی آخری سرحدوں کو چھو رہی ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اب میں زندگی کی نسبت موت سے زیادہ قریب ہوں۔ سیاست کے کوچے میں اگر میرا گزر کبھی رہا ہے تو وہ بھی صرف دو ماہ اور وہ بھی اس بناء پر کہ مرحوم صدر ضیاء الحق صاحب کے بارے میں مجھے یہ گمان ہو گیا تھا کہ یہ نیک نیت ہیں اور اسلام کے متعلق کچھ کام کرنا چاہتے ہیں تو ان کی دعوت پر میں نے ان کی مجلس شوریٰ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے تو مرکزی وزارت کی پیش کش کی تھی جس سے میں نے معذرت کر لی تھی، لیکن شوریٰ کی دعوت میں نے قبول کر لی تھی، تاہم صرف دو مہینوں ہی میں مَیں نے محسوس کر لیا کہ ان کا کچھ کرنے کا ارادہ نہیں ہے لہٰذا "قَالُوا سَلٰمًا" کے مصداق میں نے انہیں سلام کیا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے سوا میری پوری زندگی اِس وقت تک اس معروف سیاست سے خالی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ میرا یہ کام سیاست کا کھیل نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس طرح کے معاملات کو ہمارے یہاں ایک مذہبی پیشہ کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ لیکن میرے بارے میں آپ حضرات کے علم میں ہے کہ یہ میرا پیشہ نہیں تھا۔ جہاں تک پیشے کا تعلق ہے مجھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایک بہتر پیشہ عطا کر دیا تھا، جسے کہا جاتا ہے کہ بڑا نوبل پروفیشن ہے۔ چاہے انسان اپنے ذاتی کردار کی وجہ سے اسے بھی ذلیل کر کے رکھ دے، اور اسے محض کمائی کا دھندا بنا لے، لیکن واقعتاً اگر کسی پیشے کو نوبل پروفیشن کہا جا سکتا ہے تو وہ میڈیکل پروفیشن ہے اور انسان چاہے تو اس کو نوبل بنا کر رکھ سکتا ہے۔ لیکن میں نے تو اس کو بھی تج دیا --- تو میرا یہ دینی کام کسی بھی درجہ میں میرے لئے پیشے کے ضمن میں نہیں ہے۔ چنانچہ میں سیاست کی طرح اس کی بھی نفی کرتا ہوں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس سب کی نفی ہے تو پھر یہ کس لئے ہے؟ آپ یقین کیجئے کہ اولاً تو یہ صرف دینی فرض کا احساس ہے جس کے تحت میں یہ کام کر رہا ہوں۔ اسی

احساس کے تحت میں آپ کو دعوت دے رہا ہوں اور اسی کے تحت میرے ساتھی آپ کو دعوت دے کر یہاں لائے ہیں تاکہ آپ میں بھی وہ شعور پیدا ہو جائے اور آپ بھی آخرت کی جواب دہی کے احساس کے تحت اپنے ان فرائض کی بجا آوری کے لئے کمر کس لیں۔

ثانوی درجے میں میرا یہ یقین ہے کہ اسی دینی فرض کی ادائیگی پر امتِ مسلمہ کی فوز و فلاح کا دار و مدار ہے۔ اگر امت یہ کام نہیں کرے گی تو بدترین عذاب کے کوڑے اس کی کمر پر برستے رہیں گے جیسے کہ برس رہے ہیں۔ چنانچہ خواہ بوسنیا ہو' چیچنیا ہو' کشمیر ہو یا افغانستان ہو یا عالمِ عرب ہو جس پر عذابِ الٰہی کا کوڑا اب برسنے ہی والا ہے (عالمِ عرب کے بارے میں محمد رسول اللہ ﷺ نے وہ خبریں دی ہیں کہ جو ان سے واقف ہیں ان پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔) یہ ساری سزائیں اسی لئے ہیں کہ امت نے اپنا فرض ادا نہیں کیا۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کافروں سے محبت نہیں اور اہل ایمان سے دشمنی نہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!

یہ اصل میں سزا ہے۔ حال ہی میں میری جو کتاب شائع ہوئی ہے "سابقہ اور موجودہ مسلمانوں امتوں کا ماضی' حال اور مستقبل" ذرا کبھی اس کا مطالعہ کیجئے۔ آج حقیقت میں یہود کی بجائے امتِ محمد ﷺ "مَغضوب عَلیھم" کے مقام پر کھڑی ہے۔ آج کوڑے ہم پر برس رہے ہیں' عذابِ الٰہی کی گرفت میں ہم ہیں۔ آج ہم پر وہ تینوں قسم کے عذاب مسلط ہیں جن کا ذکر سورۃ الانعام میں آیا ہے: "....عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ' اَوْمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ' اَوْيَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ"۔ چنانچہ اوپر سے عذاب آئے تو بھی' پاؤں کے نیچے سے آئے تو بھی' اور آپس میں قومیتوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے ٹکرا دینے والا عذاب ہو تو وہ بھی سب سے بڑھ کر اس وقت مسلمانوں میں ہے۔ لہٰذا امتِ مسلمہ کی فلاح بھی اسی سے وابستہ ہے کہ وہ اپنے دینی فرائض کا احساس کرے۔

اور تیسرے درجے میں مجھے یہ یقین حاصل ہے اور اس کو میں نے دلائل کے ساتھ

ثابت کیا ہے کہ وہ ملک جس کو ہم "مملکتِ خداداد پاکستان" کہتے ہیں اس کی بقاء اور استحکام کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم ان دینی فرائض کو ادا کرنے کے لئے کمر کس لیں اور یہاں اللہ کے دین کو قائم کریں جس کے نام پر یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔

تو گویا میرے نزدیک اصل میں ایک تیر سے تین شکار پیش نظر ہیں۔ لیکن میرے لئے اولیت اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کو حاصل ہے' اس لئے کہ امتِ مسلمہ کی فلاح ہو یا پاکستان کی بقا اور اس کا استحکام ہو' ان کا تعلق اِس دنیا سے ہے جبکہ میرے نزدیک اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ بفحوائے : "وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ' لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ○" (العنکبوت : ۶۴) اور اس کی فلاح و کامیابی اور نجات کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آپ اپنے فرائضِ دینی کو اپنی امکانی حد تک ادا کر رہے ہوں۔ اگر یہ کرتے ہوئے اپنے رب کے حضور حاضری ہوگی تو آپ وہاں پر کم از کم قابلِ عفو تو ہوں گے' "مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ" کے مصداق یہ عذر تو پیش کر سکیں گے کہ پروردگار میں مقدور بھر ان فرائض کی ادائیگی میں لگا رہا۔ لہٰذا اصل بنیادی محرک وہی ہے یعنی اپنے فرائضِ دینی کو ادا کرنا۔ البتہ ثانوی درجے میں اس کا محرک امتِ مسلمہ کی فوز و فلاح ہے۔ امتِ مسلمہ بڑی وسیع و عریض امت ہے۔ ایک ارب سے زیادہ تعداد پر مشتمل اس امت کی دنیوی فلاح بھی اسی پر منحصر ہے۔ اور ثالثاً اس ملک خداداد پاکستان کا استحکام ہی نہیں بقا بھی اس پر منحصر ہے کہ ہم یہاں پر اس راستے کو اختیار کریں اور دین کو قائم کریں۔

ہمارے دینی فرائض

اس تمہید کے بعد اب میں آپ کے سامنے وہ دینی فرائض رکھ رہا ہوں جو میں نے سمجھے ہیں۔ میں مکرر عرض کر رہا ہوں کہ اس ضمن میں مَیں علامہ اقبال اور مولانا مودودی کا ممنونِ احسان ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر مولانا مودودی مرحوم کی تحریریں زندگی کے ایک خاص مرحلے میں سامنے نہ آگئی ہوتیں تو نہ معلوم زندگی کا رخ کیا ہوتا۔ حدیثِ نبویؐ کے الفاظ ہیں : "مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَا يَشْكُرِ اللّٰهَ" یعنی جو انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرے گا۔ تو فرائض دینی کا وہ تصور جس کا بنیادی خاکہ

اولاً علامہ اقبال سے ملا اور جس میں تفصیلات کا رنگ مولانا مودودی کی تحریروں نے بھرا' اس پر میں ۱۹ برس کی عمر سے لے کر آج ۶۳ برس کی عمر تک' یعنی ۴۴ برس سے عملاً کاربند ہوں' الحمدللہ! اور قرآن حکیم' حدیثِ نبویؐ اور سیرتِ مطہرہ کے مطالعے اور سوچ بچار سے اس تصور کے اندر نہ صرف یہ کہ وثوق بڑھا ہے' اعتماد زیادہ ہوا ہے اور اس کی گہرائی و گیرائی میں اضافہ ہوا ہے بلکہ اس کی حقانیت زیادہ سے زیادہ منکشف ہوتی چلی گئی ہے۔ تو آیئے دیکھیں کہ دینی فرائض کا وہ تصور کیا ہے۔

۱۔ بندگیٔ رب

میرے نزدیک ہر مسلمان کا پہلا فرض "عبادتِ رب" ہے' جس کو قرآن مجید نے مقصدِ تخلیقِ جن وانس قرار دیا ہے :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ (الذاریات : ۵۶)

"میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں"۔

سورۃ البقرہ (آیت ۲۱) میں ارشاد فرمایا :

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ

"اے لوگو' بندگی اختیار کرو اپنے اُس رب کی جس نے تم کو پیدا کیا"۔

اور اللہ کی اس بندگی کا مطلب ہے ہمہ تن' ہمہ وقت' ہمہ وجوہ اللہ کی اطاعت' اللہ کے احکام کی پابندی' اللہ کے اوامر و نواہی پر کاربند ہونا۔ اور یہ جزوی نہیں' کیونکہ جزوی اطاعت' اطاعت نہیں ہے' وہ تو استہزاء اور تمسخر ہے۔ آپ نے میرا ایک حکم مانا اور دوسرا حکم پاؤں تلے روند دیا تو کیا یہ اطاعت شمار ہوگی؟ اللہ کی اطاعت وہی ہے جو کہ ہمہ تن' ہمہ وجوہ ہو' چنانچہ اس کے تمام احکام کی اطاعت مطلوب ہے۔ اگر آپ نے اللہ کے کچھ حکم مان لئے اور کچھ نہیں مانے تو ذرا اپنے اس طرزِ عمل کا تجزیہ کیجئے۔ آپ نے جو حکم مانے وہ اس لئے کہ آپ کے نفس نے ان کو مان لیا' پسند کر لیا' گوارا کر لیا اور جو نہیں مانے وہ اس لئے نہیں مانے کہ آپ کے نفس نے ان کو پسند نہیں کیا۔ دونوں حالتوں میں آپ اپنے نفس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ آپ نے اللہ کا جو حکم مانا ہے وہ اس لئے نہیں مانا کہ وہ

اللہ کا حکم ہے' بلکہ اس لئے مانا ہے کہ آپ کے نفس نے آپ کو اس کی اجازت دی ہے۔ اگر آپ نے اسے اللہ کے حکم کی حیثیت سے مانا ہوتا تو آپ دوسرا حکم بھی مانتے' کیونکہ وہ بھی اللہ ہی کا ہے۔

انسان کا یہ طرز عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک کس قدر ناپسندیدہ ہے اس کے ضمن میں میں یہاں صرف ایک آیت پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جو کہ لرزا دینے والی ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے کچھ احکام سر آنکھوں پر رکھے اور کچھ پاؤں تلے روند دے تو قرآن مجید کی رُو سے اس کی کیفیت یہ ہے :

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

"کیا تم ہماری کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو؟ تو تم میں سے جو کوئی بھی یہ طرز عمل اختیار کرے گا اس کی کوئی سزا نہیں ہے اس کے سوا کہ دنیا میں ذلیل و رسوا کر دیئے جائیں۔

اب آپ دیکھ لیجئے کہ ہم دنیا میں کیوں ذلیل ہیں۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

قرآن مجید اس سوال کا جواب دے رہا ہے۔ اِس لئے کہ تم نے اللہ کے دین پر عمل اگر کیا بھی ہے تو جزوی کیا ہے' نماز روزہ ادا کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ سودی کاروبار بھی کرتے رہے ہو' حالانکہ اللہ نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی جانب سے سود ترک نہ کرنے پر اعلانِ جنگ ہے۔ تو اس طرح تم درحقیقت اس آیت کے مصداق بن گئے ہو اور اس کے نتیجے میں دنیا کی ذلت و رسوائی کے مستحق قرار پائے ہو۔

آیت کے اگلے ٹکڑے میں اس طرز عمل کی اخروی سزا کا ذکر ہے :

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

"اور قیامت کے دن یہ شدید ترین عذاب میں جھونک دیئے جائیں گے اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے جو کچھ تم کر رہے ہو"۔

تم اپنی داڑھیوں سے اور اپنی نماز روزے سے کسی اور کو چاہے دھوکہ دے لو' اللہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

تو یہ پہلا فرض ہے' جو بہت کٹھن ہے' آسان نہیں ہے۔ اسی لئے تو علامہ اقبال کہتے ہیں۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

کہ جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں' مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ لاالٰہ الااللہ کہہ دینا تو آسان ہے' لیکن اس پر پورا اترنا بہت مشکل ہے۔

فرض عبادات کا بندگیٔ رب سے تعلق : ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے بندگیٔ رب آپ کا اولین فریضہ ہے۔ نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ آپ کو وہ قوت فراہم کرتے ہیں جس سے آپ اس فرض کو ادا کر سکیں۔ نماز اس لئے دی گئی ہے کہ آپ کو یاد رہے کہ آپ نے اللہ سے عہدِ بندگی استوار کیا ہے۔ آپ ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے اس عہدِ بندگی کی تجدید کرتے ہیں۔ ہر رکعت میں کہتے ہیں : "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ "یعنی "اے پروردگار' ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے۔ اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے۔" حفیظ نے کبھی بڑا پیارا شعر کہا تھا۔

سرکشی نے کر دیئے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں

اس عہد کو تازہ کرنے کے لئے نماز ہے' مبادا تم اسے بھول جاؤ۔ روزہ اس لئے ہے کہ تمہارے اندر اپنے نفس کے تقاضوں پر کنٹرول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ روزہ کے دوران حلال چیزیں کھانے سے بھی روک دیا جاتا ہے تاکہ گیارہ مہینوں کے لئے یہ طاقت پیدا ہو جائے کہ حرام سے بچ سکو۔ قرآن حکیم میں روزے کی غرض وغایت تقویٰ بیان کی گئی ہے : "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ O" (البقرہ : ۱۸۳) یعنی "اے ایمان

والو' تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم بچ سکو۔" اسی کی خاطر یہ مشق کرائی جارہی ہے۔ عبادات دراصل مشقیں ہیں جو بندے کو اللہ کی عبادت کے لئے تیار رکھتی ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ملٹری کو ہر وقت متحرک رکھا جاتا ہے اور اس کے لئے پریڈ ہوتی رہتی ہے۔ ساڑھے سینتالیس برسوں میں جو کہ پاکستان کو بنے ہوئے ہو گئے ہیں' جنگ تو گنتی کے چند دن ہی ہوئی ہے نا! لیکن ملٹری پر جو مسلسل خرچ ہو رہا ہے' آپ کے بجٹ کا سب سے بڑا حصہ اس کے لئے مخصوص کیا جاتا ہے' اور یہ جو مسلسل movement ہو رہی ہے' آج یہ رجمنٹ اِدھر سے اُدھر جارہی ہے' وہ اُدھر سے اِدھر آ رہی ہے' اب یہ سمر ایکسرسائزز ہیں' یہ وِنٹر ایکسرسائزز ہیں' یہ سب اسی لئے ہیں تاکہ اچانک اگر کوئی وقت آجائے تو یہ مقابلہ کر سکیں۔ اسی طرح یہ عبادات نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ ہیں جو بندے کو عبادتِ رب کے لئے مستعد رکھتی ہیں۔

"مطالباتِ دین" کے نام سے میری ایک کتاب ہے' جو میری تین تقاریر پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلی تقریر کا خلاصہ میں نے آپ حضرات کے سامنے رکھ دیا ہے۔ "عبادتِ رب" ہر مسلمان کا پہلا فرض ہے۔ جب اس نے کہا کہ "رَضِیتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ رَّسُولًا وَّبِالْاِسْلَامِ دِینًا" یعنی میں اس پر راضی ہوں' میں نے تسلیم کر لیا کہ اللہ میرا رب ہے' وہ میرا مالک ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' اور میں نے قبول کر لیا اسلام کو کہ وہ میرا دین ہے۔ یہ تسلیم کرنے کے بعد پھر لازم ہے کہ اللہ بندگی کرو' اس کی اطاعت کرو:

وَاَطِیعُوا اللّٰہَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ' فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِینُ ○ (التغابن : ۱۲)

"اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو' پھر اگر تم روگردانی کرو گے تو ہمارے رسولؐ پر صاف پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں!"

۲۔ دعوت و تبلیغ

اب اگلے فرض کی طرف آیئے۔ لیکن اس سے پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ آپ

جنت خریدنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے آپ کو بہت بڑی قیمت دینی ہوگی۔ چھوٹی سے چھوٹی دنیوی کامیابیوں کے لئے بھی کتنی محنت کرنا پڑتی ہے تو ابد الآباد کی زندگی کی بہتری کے لئے کس قدر محنت درکار ہوگی۔ نبی اکرم ﷺ کے ابتدائی دور کے ایک خطبے میں الفاظ آئے ہیں : "وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا" تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ابدی جنت کے خریدار ہوں لیکن آپ کو کوئی مشقت نہ اٹھانی پڑے، کوئی مشکل پیش نہ آئے، کوئی محنت اور ایثار نہ کرنا پڑے، کوئی قربانی نہ دینی پڑے اور کوئی نقصان نہ جھیلنا پڑے۔

تن آسانیاں چاہے اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

چنانچہ آج دنیا میں ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ذلت کا نشان بنے ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم میں "ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ" کے الفاظ یہود کے لئے وارد ہوئے تھے، لیکن آج ان کا مصداق مسلمان بن گئے ہیں۔ آج یہ یہود کی شان تو نہیں ہے، وہ تو آج بہت عروج پر ہیں اور امریکہ جیسی سول سپریم پاور کے سر پر سوار ہیں۔ پوری دنیا کا مالیاتی نظام ان کے ہاتھوں میں ہے، ورلڈ بینک ہو یا آئی ایم ایف ہو انہی کے زیر تسلط ہے۔ آج اللہ کا غضب ان پر نہیں، ہم پر ہے۔ اللہ کے جس قانون کے تحت ان کی وہ کیفیت ہوئی تھی آج اُس قانون کی زد میں ہم آ گئے ہیں۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا۔ اللہ کی سنت اور اس کا قانون غیر مبدّل ہے، اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ آپ اس کی زد میں آئیں گے تو آپ گرفت میں آجائیں گے۔ بہرحال دینی فرائض کے ضمن میں ایک مسلمان کا دوسرا فرض اللہ کے اسی پیغام کے پیغامبر بن کر کھڑے ہو جانا ہے۔

دعوت و تبلیغ کا ختمِ نبوّت سے تعلق : دین کی دعوت و تبلیغ یا بالفاظِ دیگر فریضہ شہادت علی الناس ختمِ نبوت کا ایک ناگزیر تقاضا ہے۔ اگرچہ جب تک نبوت جاری تھی اُس وقت بھی تبلیغ صرف نبیؑ ہی نہیں کرتے تھے۔ آپ کو کہیں یہ مغالطہ نہ ہو جائے۔ صحابہ کرامؓ ایمان لانے کے بعد حضور ﷺ کے ساتھ دعوت و تبلیغ کے کام میں مصروف ہو

جاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی دعوت پر ایمان لائے تھے' لیکن عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم میں سے چھ حضرات کو ابوبکر رضی اللہ عنہ دامنِ اسلام میں لائے۔ حضرات طلحہ' زبیر' سعد بن ابی وقاص' عبدالرحمٰن بن عوف اور سعید بن زید رضی اللہ عنہم ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تبلیغی مساعی ہی سے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔

میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں سورۂ یوسف کی یہ آیت تلاوت کی تھی: "قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ" حضورؐ سے کہا جارہا ہے کہ اے نبی کہہ دیجئے یہ ہے میرا راستہ' میں اللہ کی طرف پکار رہا ہوں۔ "عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ" میں علیٰ وجہ البصیرت بلا رہا ہوں اور وہ بھی جو میرے پیروکار ہیں۔ یعنی میں ایسے ہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہا ہوں' کوئی سیاسی کھیل نہیں کھیل رہا ہوں' کوئی پیشہ ورانہ تقاضے پورے نہیں کر رہا ہوں' اسے کوئی اپنا دنیوی دھندا اور جائیداد بنانے کا ذریعہ بنا کر لوگوں کو دعوت نہیں دے رہا ہوں بلکہ علیٰ وجہ البصیرت اس کام کو اپنا دینی فریضہ سمجھ کر کر رہا ہوں۔ اور اس کام میں میں تنہا نہیں ہوں' جو میرا اتباع کرنے والے ہیں وہ بھی میرے اسی مشن میں شریک ہیں۔ "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ" میں سے ہر ایک مبلغ تھا۔

لیکن ظاہر بات ہے کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد اب نبی تو کوئی نہیں آئے گا' چنانچہ اب دعوت و تبلیغ کا یہ کام تمام تر امتِ مسلمہ پر بحیثیتِ مجموعی فرض ہو گیا ہے۔ میں نے یہاں "فرض" کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے' کیونکہ یہ کوئی نفل نہیں ہے' اضافی نیکی نہیں ہے' بلکہ یہ بنیادی فرض ہے۔ اس لئے کہ امتِ مسلمہ کو تمام بنی نوع انسانی پر بحیثیتِ مجموعی حجت قائم کرنی ہے تاکہ وہ قیامت کے دن کھڑے ہو کر یہ نہ کہہ سکے کہ اے اللہ تیرے دین کے ٹھیکیدار تو یہ تھے' تیرے نبیؐ کے ٹھیکیدار بھی یہ بنے پھرتے تھے' یہ بڑے لہک لہک کر گایا کرتے تھے ع "سارے نبیوں سے افضل ہمارا نبیؐ"۔ "وہ نبیؐ جس کو تو نے ہمارے لئے بھیجا تھا' پوری نوعِ انسانی کے لئے مبعوث فرمایا تھا یہ اس کو اپنا نبی بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ قرآن تو کہتا ہے "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا" یعنی "ہم نے نہیں بھیجا (اے محمد ﷺ) آپ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لئے

بشیر و نذیر بنا کر"۔ لیکن یہ اس کے بھی ٹھیکیدار بن گئے تھے' دین کے بھی ٹھیکیدار بن گئے تھے۔ لیکن ان بدبختوں نے نہ خود دین پر عمل کیا اور نہ اسے ہم تک پہنچایا' بلکہ اپنے وجود سے' اپنے طرز عمل سے' اپنے کردار سے اور اپنے پورے نظامِ زندگی سے ہمارے اور تیرے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ بن گئے۔ ہم انہیں دیکھتے یا تیرے دین کو دیکھتے۔ ہم نے تو تیرے دین کو انہی سے پہچانا۔ یہ تیرے نبی محمد (ﷺ) کے نام لیوا تھے۔ دنیا میں تو اصول یہ ہے کہ درخت کو پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ درخت پر آم کا پھل لگا ہوا ہے تو وہ آم کا درخت ہے' لیموں لگا ہوا ہے تو لیموں کا پودا ہے اور کنّو لگا ہوا ہے تو کنّو کا پودا ہے۔ تو یہ جو پھل ہیں اس دین کے اور رسالتِ محمدیؐ کے یہ "بدنام کنندگانِ نکونامے چند" ہیں' یعنی نیکو کاروں اور نیک نام لوگوں کو بھی بدنام کرنے والے ہیں۔ اس طرح قیامت کے دن حجت تو الٹی ہم پر قائم ہو جائے گی' چہ جائکہ ہم ان پر حجت قائم کرتے۔

امتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس : قرآن حکیم میں فریضہ شہادت علی الناس کو اس امت کا فرضِ منصبی ہی نہیں' اس کی غرضِ تاسیس قرار دیا گیا ہے :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ : ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا تاکہ تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر اور رسولؐ تم پر گواہ ہو جائے"۔

اور ظاہر ہے کہ امت افراد سے مل کر بنتی ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اگر آپ بھی یہ کہہ کر فارغ ہو جائیں کہ یہ تو امت کا کام ہے میرا تو نہیں ہے اور اسی طرح میں بھی یہ کہہ کر فارغ ہو جاؤں تو پھر یہ کام کرے گا کون؟ ہماری علاقائی زبان کی ایک کہاوت تھی "میں بھی رانی تو بھی رانی' کون بھرے گا پانی" امت کا ہر فرد تو اپنی جگہ یہ کہہ کر بَری ہو جائے کہ یہ فرض امت کا ہے میرا تو نہیں ہے' تو یہ فرض کیسے ادا ہو گا؟ دین میں فرضِ کفایہ کا تصور یہی ہے کہ ایک کام کے لئے جتنی ضرورت ہے وہ اگر چند افراد نے پوری

کر دی تو سب کی طرف سے وہ فرض ادا ہو گیا' لیکن ضرورت پوری کرنے کے لئے جتنے افراد چاہئیں تھے' وہ اگر نہیں نکلے تو پھر پوری آبادی گنہگار اور مجرم ٹھہرے گی۔ آج امت پوری نوع انسانی پر دعوت و تبلیغ کے ذریعے اور اپنے قولی و عملی مظاہرے کے ذریعے اللہ کی طرف سے حجت قائم نہیں کر رہی ہے تو امت کا ایک ایک فرد مجرم ہے۔ لہٰذا یہ فریضہ ایک ایک فرد پر فرضِ عین کی طرح عائد ہوتا ہے کہ اپنی توانائیاں' اپنی قوتیں اور اپنی صلاحیتیں اس کام کے لئے لگائے کہ اللہ کے پیغام کو عام کرنا ہے' اسے چار دانگِ عالم میں پھیلانا ہے' اسے بنی نوع انسان تک پہنچانا ہے۔

دعوت و تبلیغ کا مرکز و محور : اللہ کے پیغام کو عام کرنے کا اصل ذریعہ قرآن حکیم ہے۔ آج کی نشست میں وقت محدود ہونے کے باعث میں اختصار سے کام لے رہا ہوں۔ قرآن حکیم میں بیسیوں مقامات پر خود قرآن کو دعوت' تبلیغ' تذکیر' تبشیر اور انذار کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ ق کی آخری آیت میں فرمایا گیا :

فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ

"(اے نبیؐ) اِس قرآن کے ذریعے سے ہر اس شخص کو نصیحت کیجئے جو میری تنبیہہ سے ڈرتا ہو۔"

(سورۃ الانعام (آیت ۱۹) میں ارشاد ہوا :

وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ

"(آپؐ کہہ دیجئے) اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے' سب کو متنبہ کر دوں"۔

یعنی جس تک یہ قرآن پہنچ جائے گا گویا کہ رسالتِ محمدیؐ کا پیغام اس تک پہنچ گیا۔ لیکن اب ہم اسے پہنچائیں گے تبھی تو پہنچے گا! سورۂ مریم کی آخری سے پہلی آیت میں الفاظ وارد ہوئے ہیں :

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ○

"پس اے نبیؐ' اس کلام کو ہم نے آپ کی زبان پر آسان کر دیا ہے تاکہ آپ اس کے ذریعے پرہیزگاروں کو خوش خبری دے دیں اور ہٹ دھرم لوگوں کو متنبہ

کریں۔"

سورۃ المائدہ (آیت ۶۷) میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا:

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ

"اے پیغمبر، جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔"

گویا دعوت و تبلیغ کا پورا مرکز و محور قرآن ہے، جو آپ کا دوسرا فرض ہے۔ اور یہ دوسرا فرض آپ کیسے ادا کریں گے اگر آپ خود قرآن سے واقف نہیں ہیں۔ اس سنجیدہ گفتگو میں لطیفوں کی گنجائش تو نہیں، لیکن ایک مناسب حال لطیفہ پیش کر رہا ہوں کہ کوئی خان صاحب کسی بنئے کی گردن پر سوار ہو گئے کہ پڑھو کلمہ ورنہ ابھی گردن اڑاتا ہوں۔ بنئے نے کہا: اچھا خان صاحب پڑھاؤ کلمہ۔ اس پر خان صاحب کہنے لگے: "خو کلمہ تو ہمیں بھی نہیں آتا۔" تو آپ قرآن کیا پہنچائیں گے اگر آپ قرآن جانتے ہی نہیں۔ اسی لئے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ (رواہ البخاری عن عثمانؓ بن عفان)

"تم میں بہترین وہ ہے جس نے خود قرآن کو سیکھا اور اسے دوسروں کو سکھایا۔"

چنانچہ قرآن سیکھو اور سکھاؤ، اسے پڑھو اور پڑھاؤ۔ یہ ضروری نہیں کہ فارغ التحصیل ہونے تک انتظار کرو بلکہ اگر تم نے ایک آیت بھی سمجھ لی ہے تو اس کو پھیلانا شروع کر دو۔ حدیثِ نبویؐ ہے: "بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً" یعنی "پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت"۔ لیکن جو بات میں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ کام فرضِ عین ہے۔ اگر اس میں کوتاہی کریں گے تو فرض کی عدم ادائیگی کے مجرم ہوں گے۔

۳۔ اقامتِ دین

دینی فرائض کے ضمن میں اب ہم تیسرے فرض کو لیتے ہیں۔ آپ جانتے ہوں گے کہ اسلام دین ہے مذہب نہیں۔ اور دین وہی ہوتا ہے جو قائم ہو، نافذ ہو، غالب ہو۔ اگر مغلوب ہو گیا تو دین نہیں رہا، مذہب ہو گیا۔ مثلاً جب عالمِ عرب میں آنحضور ﷺ اور

آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ کی محنتوں' مشقتوں اور ایثار و قربانی سے اسلام غالب ہو گیا تو پھر جب صحابہ کرامؓ کے لشکر نکلتے تھے تو تین Options دیتے تھے۔ اولاً : اسلام لے آؤ تو ہمارے برابر کے ہو جاؤ گے' ہمارے بھائی بن جاؤ گے' تمہاری جائیدادیں' تمہاری املاک' جان و مال اور عزت و آبرو سب محفوظ ہو جائیں گے۔ تم ہمارے ہم پلّہ ہو گے۔ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ ہم پرانے مسلمان ہیں' تم نو مسلم ہو لہٰذا ہمارا حق زیادہ ہے' بلکہ ہم تم برابر ہوں گے۔ ثانیاً : اگر یہ قبول نہیں تو نیچے ہو کر رہنا اور جزیہ دینا گوارا کرو' غالب اسلام ہو گا اور تم یہودی' عیسائی' مجوسی یا ہندو جو چاہو بن کر رہو۔ خواہ ایک کو مانو' سو کو مانو' ہزار کو مانو' بتوں کو پوجو' آگ کو پوجو' جو چاہو کرو۔ تمہاری جان اور مال محفوظ ہوں گے' البتہ تم سے جزیہ لیا جائے گا' لیکن غالب دین اسلام ہو گا۔ ثالثاً : اگر یہ بھی قبول نہیں تو میدان میں آؤ' تلوار ہمارے اور تمہارے مابین فیصلہ کرے گی۔ یہ اُس وقت کی صورت حال تھی جب اسلام غالب تھا۔ تب "دین" اسلام تھا اور اس کے تحت مختلف "مذاہب" تھے۔

اسلام "مذہب" کیسے بنا؟ : جب برعظیم ہندوپاک پر انگریز کا تسلط ہو گیا تو معاملہ برعکس ہو گیا۔ اب انگریز کے نظام نے "دین" کی حیثیت اختیار کر لی اور اسلام "مذہب" بن کر رہ گیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ دین انگریز کا ہو گا' تم نماز پڑھو' روزہ رکھو' حج کرو' داڑھیاں رکھو' جو چاہو کرو' ہم یہ نہیں کہتے کہ تم ضرور شراب پیو یا زنا کرو۔ ہاں ہم زنا کے لائسنس دیں گے' شراب کے پرمٹ جاری کریں گے' تم کون ہوتے ہو روکنے والے؟ اب یہاں فوجداری قانون ہمارا ہو گا' دیوانی قانون ہمارا ہو گا!! گویا انگریز کے دین کے تحت تابع ہو کر ہندو ہندو رہے' مسلمان مسلمان رہے' ہندو مندر میں جائے' مسلمان مسجد میں جائے' ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ تم چاہے ساری رات نماز میں کھڑے رہا کرو اور روزے تیس دن کی بجائے ۳۶۵ دن کے رکھا کرو' ہمیں کیا اعتراض ہے! تو یہ تھا وہ Reversal کہ اب اسلام دین نہیں رہا بلکہ مذہب بن گیا اور سورۂ یوسف میں وارد ہونے والے الفاظ "دِین المَلِک" کے مصداق "دین" کی حیثیت تختِ انگلستان پر بیٹھنے والے ملکِ معظم یا ملکہ معظمہ کے نظام نے حاصل کر لی۔ چنانچہ خواہ وہ ملکہ ہے یا مَلِک ہے' دین اس کا ہے' نظام اس کا ہے' دیوانی اور فوجداری قانون اسی کا چلے گا' taxation کا نظام اس کا ہو گا'

خراج وہ وصول کرے گا۔ تم اپنی جگہ عبادات کرتے رہو' تمہیں اس کی اجازت ہے۔

یہ شہادت گہہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے : بہرحال تیسرا اور سب سے کٹھن دینی فریضہ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدّوجہد کرنا ہے۔ ویسے تو آسان کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جنت خریدنے نکلے ہیں' جسم و جان کی ساری توانائیاں نچوڑ دیں گے تب جنت ملے گی' جنت کوئی اتنی گھٹیا' حقیر اور بے وقعت شے نہیں ہے کہ یونہی مل جائے۔ چنانچہ پہلا قدم بھی آسان نہیں تھا۔ بقول اقبال۔

"چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لاالٰہ را"

مسلمان بننا ہی آسان کام نہیں ہے' اس کے لئے نفس کے خلاف لڑائی لڑنی پڑے گی' ماحول کے خلاف مدافعت کرنا پڑے گی' شیطان اور اس کی ذریتِ معنوی و صلبی کے خلاف جنگ آزما ہونا پڑے گا' تب کہیں اللہ کی اطاعت کر سکیں گے اور اس کے رسول ﷺ کا اتباع کر سکیں گے۔

دوسرے فریضے کی ادائیگی میں اپنے شاندار کیریئر چھوڑنے پڑیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہی وقت اور توانائی خواہ آپ پیسے کمانے میں لگا دیں' اس سے اپنے پروفیشن میں مہارتِ تامہ بہم پہنچائیں اور اس سے جائیدادیں بنائیں' اور وہی وقت اور توانائی اگر آپ اِدھر لگائیں گے تو اپنی دنیا سکیڑنی پڑے گی۔ ع "میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا" کے مصداق انسان کو اپنے سامنے دیکھنا ہوتا ہے کہ دوسروں کی دنیا پھیل رہی ہے اور میری سکڑ رہی ہے۔ مکہ مکرمہ میں لوگوں کے سرمائے بڑھ رہے تھے' لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سکڑ رہے تھے۔ مکہ کا اتنا بڑا تاجر' ملک التجار' ہجرت کے وقت تک بارہ برسوں میں وہ اللہ کا بندہ اللہ کے دین کی خاطر اپنا سب کچھ لگا چکا تھا اور جو تھوڑی سی پونجی بچ گئی تھی وہ بھی سفرِ ہجرت میں ساتھ لے کر گیا' اپنی دونوں بچیوں (حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ) بیوی اور بوڑھے نابینا باپ کے لئے ایک پیسہ نہیں چھوڑا۔ ابو قحافہ اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے' مشرک تھے' بعد میں فتح مکہ کے بعد ایمان لائے۔ وہ بچیوں سے کہنے لگے : "کیا ابوبکر چلا گیا؟" انہوں نے کہا : "جی دادا جان!" پوچھا : "کچھ چھوڑ کر بھی گیا ہے؟" انہوں نے

بڑی حکمت برتی' کچھ کنکر لے کر ایک رومال میں ڈالے اور اس پر بوڑھے دادا کا ہاتھ پھیرا کہ دادا جان' یہ دیکھئے' یہ مال چھوڑ کر گئے ہیں۔ تو یہ دنیا سکڑتی ہے تب کام ہوتا ہے۔ ابھی تو معروف معنوں میں جہاد شروع ہی نہیں ہوا تھا' ابھی اذنِ قتال نہیں آیا تھا' ابھی تو دعوت ہی چل رہی تھی۔ لیکن اس دعوت کے مرحلے میں بھی انسان کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنا وقت اور صلاحیتیں کاروبار میں لگائے یا دعوت میں لگائے۔ انسان کے پاس وقت' توانائیاں اور قوتِ کار قسم کی چیزیں تو محدود ہی ہوتی ہیں' اگر ان کو انسان دعوت و تبلیغ میں لگادے تو اپنا دھندا تو سمٹے گا۔ لیکن اس کے باجود میں کہہ رہا ہوں کہ یہ بڑی مشکل اور کٹھن منزل ہے۔

اور سب سے کٹھن اور سب سے اونچی منزل ہے دین کو قائم کرنا۔ اور وہ اس لئے کہ دین کو قائم کرنے کا مطلب نظام کی تبدیلی ہے' یعنی جو نظام بالفعل قائم ہے اسے ہٹایئے اور دین کے نظام کو لایئے۔ اب جو نظام کہیں قائم ہوتا ہے اس کے ساتھ کچھ طبقات کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ جاگیردارنہ نظام ہے تو اس کے ساتھ جاگیرداروں کے مفادات ہیں۔ کیا وہ پسند کریں گے کہ ان کا نظام بدل دیا جائے؟ سعودی عرب میں بادشاہی نظام قائم ہے۔ کیا وہ پسند کریں گے کہ ان کا یہ شاہی نظام ختم کردیا جائے؟ وہ تو اس کا نام لینے والوں کی تکہ بوٹی کردیں گے۔ کیا ایران کا بادشاہ آسانی سے چلا گیا تھا؟ اس نے کتنے انسانوں کی تکہ بوٹی کی تھی' کتنے لوگ تھے کہ جن کو ساوک کے بھیڑیوں نے maim کیا' جن کے بازو کاٹ دیئے' جن کے جسم مفلوج کردیئے۔ اور پھر کتنے ہزاروں تھے کہ جن کے لاشے سڑکوں پر تڑپے ہیں' نہ صرف مَردوں کے بلکہ عورتوں کے بھی۔ عورتوں کا جلوس نکلا تھا شیر خوار بچوں کو گود میں لے کر' جس پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی۔ اس کے بعد بادشاہ وہاں سے بھاگا ہے کہ اگر یہاں کی عورتیں اپنے شیر خوار بچوں کو گود میں لے کر فائرنگ سکواڈ کے سامنے آ سکتی ہیں تو پھر کل میرا حشر کیا ہوگا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کا اسلحہ ختم ہوگیا تھا۔ اسلحہ تو اس کے پاس بے شمار تھا' پورے ایشیا میں اتنا بڑا اسلحہ خانہ کسی اور ملک کے پاس نہیں تھا' لیکن وہ عوام کی طاقت کے آگے کھڑا نہ رہ سکا۔ عوام اگر مرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو پھر بڑی سے بڑی طاقت ان کو شکست نہیں دے سکتی۔ لیکن بہرحال نظام کا بدلنا آسان نہیں۔ اور یہ

ہے "اقامتِ دین" جو فرائضِ دینی کی تیسری اور بلند ترین منزل ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں مسلمانوں کو اسی فریضہ کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے :

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ

"(اے مسلمانو!) اس نے تمہارے لئے بھی دین کے بارے میں وہی شے معیّن کی ہے جس کی وصیت کی تھی اس نے نوحؑ کو اور جو وحی کی ہے ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کی جانب اور جس کی وصیت کی تھی ابراہیمؑ کو اور موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو کہ دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ!"

اسی تسلسل میں آگے چل کر آیت ۱۹ میں فرمایا گیا :

اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ○

"اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے' وہ جسے چاہتا ہے رزق دیتا ہے' اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے"۔

آدمی کو اقامتِ دین کی جدّوجہد سے روکنے والی سب سے بڑی چیز اس کے معاشی معاملات و مسائل ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں اطمینان دلا دیا گیا کہ اللہ بڑا باریک بین ہے' وہ اپنے بندوں کی تمام ضرورتوں سے واقف ہے' وہ چڑیوں کو کھلا رہا ہے پلا رہا ہے تو کیا تمہیں نہیں کھلائے گا؟ لیکن تمہارا اس پر توکّل نہیں ہے' تم اللہ پر بھروسہ نہیں رکھتے' تمہارا ایمان و یقین کمزور ہے۔

عملی نمونے کی ضرورت : بہرحال نوٹ کیجئے کہ یہ سب سے کٹھن اور مشکل کام ہے۔ اور جب تک یہ نہیں ہوتا تم دنیا میں کہیں بھی پوری نوعِ انسانی کو کوئی نمونہ نہیں دکھا سکتے کہ یہ ہے اسلام۔ اُس وقت تک پوری امتِ مسلمہ کتمانِ حق کی مجرم ہے' اس نے حق کو چھپایا ہوا ہے' بلکہ اپنے وجود اور اپنے طرزِ عمل سے دوسروں کو حق سے روکنے کا سبب بنی ہوئی ہے۔ آپ دنیا کو پورے روئے ارضی پر ایک ملک تو ایسا دکھا سکیں کہ "آؤ بھائی جسے اسلام دیکھنا ہو وہ یہاں آکر دیکھ لے۔ یہ صرف نظریاتی باتیں نہیں ہیں' صرف لفاظی نہیں ہے' صرف وہم اور خیالات نہیں ہیں' بلکہ ہم اسلام کا عملی نمونہ پیش کر رہے ہیں۔

آؤ دیکھو، یہ ہمارا ملک ہے جہاں اسلام کا نظام قائم ہے، اس کی سیاست اور معیشت کو دیکھو، یہاں کی اخوت کا نقشہ دیکھو، ہمارا کفالتِ عامہ کا نظام ملاحظہ کرو کہ نہ صرف ایک ایک آدمی بلکہ حیوانات تک کی کفالت کا انتظام ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی ریاست کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے فرمایا تھا کہ دجلہ و فرات کے کنارے اگر کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے دن عمر اس کا ذمہ دار ہوگا۔ تو آؤ دیکھو، یہ ہے کفالتِ عامہ کا نظام۔ ہمارے ہاں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے، سب برابر ہیں، پیدائشی طور پر کوئی ادنیٰ نہیں، کوئی اعلیٰ نہیں۔ یہ صرف کہنے کی باتیں نہیں ہیں، کوئی لفاظی نہیں ہے، بلکہ آؤ اور ہمارا معاشرہ دیکھو۔ اگر پوری دنیا میں کوئی ایک ملک بھی ایسا ہو تو پوری امتِ مسلمہ کی طرف سے شہادت علی الناس کا فرضِ کفایہ ادا ہو جائے گا۔ اور اگر ایک بھی نہیں ہے تو پوری امت مجرم ہے اور اس جرم کی پاداش میں عذاب کے کوڑے پڑتے رہیں گے اور ہر آنے والا کوڑا پہلے سے سخت تر ہوگا۔

(جاری ہے)

فکرِ اقبال کے وارث اور شارح ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم
کی فکر انگیز تصنیف "Manifesto of Islam" کا اردو ترجمہ

منشورِ اسلام

کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے

مترجم : ڈاکٹر ابصار احمد

صفحات ۱۷۲، نفیس کتابت، سفید دبیز کاغذ، دیدہ زیب ٹائٹل، عمدہ مضبوط جلد

قیمت صرف۔/ ۷۲ روپے

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

الہدیٰ۔قسط : ۹۶

مباحثِ صبرو مصابرت

صلح حدیبیہ۔ایک عظیم فتح کی تمہید

سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی روشنی میں

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

اب اس سے قبل کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے ان آخری سالوں کے دوران آپ کی جدوجہد کے ان دونوں رخوں کو سمجھنے کی کوشش کریں' آیئے کہ پہلے ایک نگاہ ان آیاتِ مبارکہ کے ترجمے پر ڈال لیں جن سے اس گفتگو کا آغاز ہوا تھا یعنی سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی آیات۔ فرمایا :

آیاتِ مبارکہ کے ترجمے پر ایک نظر

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ﴾ ترجمہ : "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا۔" حضورؐ نے عمرے کی غرض سے جس سفر کا ارادہ فرمایا تھا اس سے پہلے آپؐ نے ایک خواب دیکھا تھا کہ آپؐ عمرہ ادا فرما رہے ہیں۔ نبی کا خواب ایک نوع کی وحی ہوتا ہے' چنانچہ آپؐ نے اسی کی بنیاد پر سفر اختیار فرمایا۔ جب صلح حدیبیہ کے بعد یہ طے ہو گیا کہ عمرہ اس سال نہ ہو سکے گا تو بعض حضرات نے یہ خیال کیا کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ خواب جھوٹا ہو گیا! نعوذ باللہ من ذٰلک!! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وضاحت فرما کر ان کے اس مغالطے کو دور کیا کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ خواب اسی سال ضرور پورا ہو گا' ہم عمرہ ان شاء اللہ ضرور کریں گے' یہ خواب غلط نہیں ہے۔ کم از کم اس سفر کا یہ فائدہ تو ہوا کہ مشرکین مکہ نے مسلمانوں کی حیثیت کو تسلیم کر لیا اور آئندہ سال کے لئے طے ہو گیا کہ "مسلمان عمرہ ادا کریں گے اور مشرکین ان کی راہ میں حائل نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اگلے سال کے ذوالقعدہ ۷ھ میں وہ عمرہ ہوا جسے عمرۂ قضاء کہتے

ہیں۔ تو یہاں دراصل اسی بات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا۔ تم یقیناً داخل ہو گے مسجدِ حرام میں' ان شاء اللہ پورے امن کی حالت میں' اپنے سروں کو مونڈتے ہوئے بھی اور بال ترشوائے ہوئے بھی' اس حالت میں کہ تمہیں کسی کا خوف نہ ہو گا' تو اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تم نہیں جانتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ایک قریبی فتح کا سامان کر دیا---- یعنی یہ کہ یہ صلح اب تمہارے لئے کامیابیوں کے نئے نئے دروازے کھولنے کا باعث بنے گی۔ تم بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ صلح کے جس معاہدے کو قریش مکہ اپنی فتح سمجھ رہے تھے وہ ان کی شکست تھی' چنانچہ وہ عمومی تاثر کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے دب کر صلح کی ہے' غلط ثابت ہوا اور یہ صلح مسلمانوں کے حق میں ایک فتح عظیم ثابت ہوئی۔

اس کے بعد یہاں سورۃ الفتح کے آخری رکوع میں بھی وہی آیۂ مبارکہ وارد ہوئی ہے جو آنحضورؐ کے مقصدِ بعثت کے بیان کے ضمن میں قرآن حکیم کی اہم ترین آیت ہے۔ (واضح رہے کہ یہ آیت اس سے قبل سورۃ الصف کے درس کے ضمن میں ہمارے مطالعے سے گزر چکی ہے) اس آیت کو اگر پورے قرآن مجید کا عمود قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ ترجمہ: "وہی ہے (اللہ) جس نے اپنے رسول (محمد ﷺ) کو مبعوث فرمایا الھدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق دے کر تاکہ غالب کر دیں اسے پورے کے پورے دین (یعنی نظام زندگی) پر"---- ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾ "اور کافی ہے اللہ گواہی دینے والا۔" اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ ہو کر رہے گا' اور اب یہ دعوت درحقیقت اپنی اس منزل سے قریب ہوا چاہتی ہے' کامیابی اس کے قدم چوما چاہتی ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ محمد اللہ کے رسول ہیں۔" ﴿صلی اللہ علیہ وسلم﴾ ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ﴾ "اور وہ لوگ کہ جو ان کے ساتھ ہیں"۔ یعنی آپؐ پر ایمان لانے والے آپؐ کے صحابہؓ' آپؐ کے جان نثار' آپؐ کے دست و بازو' آپؐ کے اعوان و انصار رضی اللہ عنہم اجمعین۔ یہ مقام عظمتِ صحابہ کے بیان کے ضمن میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ

بَيْنَهُمْ ﴾ "اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابلے میں بڑے سخت اور آپس میں انتہائی نرم ہیں۔" انہیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ مقابلے میں ان کا باپ ہے یا بیٹا۔ ان کا رشتہ صرف اللہ اور اس کے رسول ؐ سے ہے۔ ان کی تمام محبتیں اس معیار پر اور اسی ایک بنیاد پر از سرِنو استوار ہو چکی ہیں۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا : "مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ " یعنی "جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے کی، کسی سے بغض اور عداوت رکھی تو اللہ کے لئے رکھی، کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لئے دیا اور کسی سے کچھ روکا تو صرف اللہ کے لئے روکا، تو وہ ہے کہ جس نے اپنے ایمان کی تکمیل کرلی۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس معیار پر کاملتاً پورا اترتے ہیں۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں چشمِ فلک نے وہ نظارہ دیکھا کہ باپ اِدھر ہے اور بیٹا اُدھر، ماموں اِدھر ہے تو بھانجا اُدھر، بھتیجا اِدھر ہے تو چچا اُدھر۔ اِدھر حضور ﷺ ہیں اور اُدھر عباس بن عبدالمطلب ہیں جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ اِدھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور اُدھر ان کے بیٹے عبدالرحمٰن۔ اور ایمان لانے کے بعد عبدالرحمان بن ابی بکرؓ نے جب اپنے والد محترم حضرت ابوبکر صدیقؓ سے یہ کہا کہ ابا جان! میدانِ بدر میں آپ میری تلوار کی زد میں آ گئے تھے لیکن میں نے آپ کا لحاظ کیا تو جواب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا : بیٹے، یہ اس لئے تھا کہ تمہاری جنگ حق کے لئے نہیں تھی، خدا کی قسم اگر کہیں تم میری زد میں آ جاتے تو میں بالکل نہ چھوڑتا۔ اس لئے کہ یہاں معاملہ بالکل بدل چکا ہے۔ تاہم دوسری طرف وہ آپس میں انتہائی نرم اور مہربان ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹنے والے، ایک دوسرے کے دکھ اور درد کو اپنے باطن میں محسوس کرنے والے، اس شان کے حامل جس کی تعبیر علامہ اقبال نے ایک شعر میں اس طرح کی ہے کہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

اور جس کا نقشہ سورۃ المائدہ میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے : ﴿ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ یعنی "ان سے اللہ محبت کرتا

ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں' اہلِ ایمان کے حق میں بہت ہی نرم ہیں لیکن کافروں کے لئے بہت سخت ہیں"۔ کفار کے مقابلے میں ان کے موقف میں کہیں کسی کمزوری کا اظہار نہیں ہوتا۔ ﴿یُجَاهِدُونَ فِی سَبِیلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ "اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں (جان اور مال لگاتے کھپاتے ہیں) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے"۔

اب ہم سورۃ الفتح کی آخری آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ فرمایا: ﴿تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ "تم انہیں دیکھتے ہو رکوع کرتے اور سجدہ کرتے ہوئے' وہ اپنے رب کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی ہیں"۔ ذہن میں رکھئے کہ بندۂ مومن کی شخصیت کے یہ دو رخ ہیں جن کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر ملتا ہے۔ ایک رخ محبتِ خداوندی' جذبۂ عبودیت اور اس کی کیفیات سے متعلق ہے جبکہ دوسرا جہاد و قتال اور ایثار و قربانی سے عبارت ہے۔ یہاں ان الفاظ میں پہلے رخ کا بیان ہے کہ: ﴿تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ ان کی زندگی کا یہ نقشہ تمہارے سامنے ہے کہ وہ اللہ کی جناب میں رکوع اور سجود کرنے والے ہیں' وہ اپنے رب کے فضل کے طالب اور اس کی رضا کے جویا ہیں۔ ان کا نصب العین بس رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ ﴿سِیمَاهُمْ فِی وُجُوهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُودِ﴾ "ان کی نشانی ہے ان کے چہروں میں (ان کی پیشانیوں میں) سجدوں کے اثرات سے"۔ ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیلِ﴾ "یہ ان کی مثال ہے تورات میں اور ان کی یہ تمثیل ہے انجیل میں بھی"۔ تورات اور انجیل کے بارے میں یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیشین گوئیاں ان کتابوں میں موجود تھیں جن میں سے بہت سی کھرچ دی گئیں' نام و نشان مٹانے کی ہر ممکن سعی کی گئی پھر بھی کہیں کہیں کوئی کوئی پیشین گوئی باقی رہ گئی۔ قرآن مجید کے یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ کی علامات کا بیان بھی تورات اور انجیل میں تھا' ان کی شخصیتوں کے نمایاں اوصاف اور خدوخال بھی ان میں درج تھے۔ وہ مشہور واقعہ اس بات کی تائید کرتا ہے جو بیت المقدس کی فتح کے ضمن

میں تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے کہ جب مسلمان افواج یروشلم کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں اور محاصرہ بھی بہت طول پکڑ گیا تو وہاں محصور عیسائی رہنماؤں نے کہا کہ ایک درویش بادشاہ کی علامات ہماری کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں جس کے ہاتھوں یہ شہر فتح ہو گا۔ بعد میں ثابت ہوا کہ وہ درویش بادشاہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ اس لئے کہ وہ جب بیت المقدس تشریف لائے تو وہاں کے لوگوں نے اپنی کتابوں سے حضرت عمرؓ کا حلیہ ملانے کے بعد شہر کے دروازے مسلمانوں کے لئے یہ کہتے ہوئے کھول دیئے کہ یہی وہ شخص ہے جس کی علامات ہماری کتابوں میں درج ہیں!

آگے فرمایا: ﴿ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ ﴾ "اس کھیتی کے مانند جو پہلے اپنی سوئی نکالتی ہے' پھر اس کی کمر کو مضبوط کرتی ہے' پھر ذرا موٹی ہوتی ہے۔ پھر کھڑی ہو جاتی ہے اپنی نال پر" ﴿ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ﴾ کاشت کار کو وہ بڑی بھلی لگتی ہے (اس کا دل اس کھیتی کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے) تاکہ دلوں میں جلن پیدا ہو جائے کفار کے۔ یہاں کھیتی سے مراد صحابہ کرامؓ کی جماعت ہے۔ یہ پودا جو شروع میں بڑا نرم و نازک اور کمزور تھا اب ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کاشتکار کون ہے؟ خود اللہ تبارک و تعالیٰ جس کی یہ کھیتی ہے' یا پھر وہ ذاتِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم جس نے اپنے خون جگر سے اس کھیتی کو سینچا ہے۔ انؐ کا دل اس شاندار فصل کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور وہ کفار و منافقین جن کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض تھا' انؓ کی کامیابیوں پر اپنے دل میں جلن اور گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ کہ ان لوگوں سے کہ جو ایمان اور عملِ صالح کے معیار پر پورا اتریں' اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ دنیا میں بھی فتح و کامرانی ان کے قدم چوم رہی ہے اور آخرت کے اعتبار سے وہ کامیاب و کامران ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان صاحب ایمان اور نیکوکار لوگوں سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔!

صلح کے ٹوٹنے پر قریش کی جانب سے تجدید کی سرتوڑ کوشش

صلح حدیبیہ کے بعد کہ جسے قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا' واقعتاً کامیابیوں نے مسلمانوں کے قدم چومنے شروع کئے اور اس فتح و نصرت کا اظہار دو پہلوؤں سے ہوا۔ ایک یہ کہ جیسا کہ اس سے قبل ایک موقع پر اشارہ کیا جا چکا ہے' اندرونِ عرب دو سال تک یہ صلح قائم رہی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ کا بھرپور موقعہ میسر آیا۔ اس دوران بہت سے قبائل نے اسلام قبول کیا اور اسلام کا دائرۂ اثر عرب کے کونے کونے تک پہنچ گیا اور دوسرے یہ کہ اسی عرصے میں آپؐ نے بیرونِ ملکِ عرب اپنی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز فرمایا' آس پاس کے حکمرانوں کی طرف اپنے سفیر بھیجے اور نامہ ہائے مبارک کے ذریعے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔

قریش کی ایک غلطی سے یہ صلح ختم ہوئی۔ انہوں نے ایک قبیلے کے خلاف کہ جو مسلمانوں کا حلیف تھا' اپنے ایک حلیف قبیلے کی مدد کی۔ اس طرح گویا خود انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا اور یوں صلح ٹوٹ گئی۔ لیکن اس کے فوراً بعد سردارانِ قریش کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان سے بہت بڑی حماقت سرزد ہوئی ہے۔ چنانچہ فوراً ہی ان کی جانب سے تجدیدِ مصالحت کی کوششوں کا آغاز ہو گیا کہ کسی طرح صلح دوبارہ ہو جائے۔ ابوسفیانؓ جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور قریش کی سرداری کا منصب انہیں حاصل تھا' صلح کی تجدید کے لئے خود چل کر مدینے آئے۔ اس ضمن میں نہایت دلچسپ اور عجیب واقعات سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ابوسفیانؓ مدینے آتے ہیں اور اپنی صاحبزادی حضرت امِّ حبیبہؓ جو آنحضورؐ کی زوجہ محترمہ ہیں' کے پاس جاتے ہیں کہ وہ ان کے لئے اپنے شوہر سے (یعنی نبی اکرمؐ) سے سفارش کریں۔ وہاں یہ عجیب معاملہ پیش آتا ہے کہ گھر میں داخل ہو کر جب چارپائی پر بیٹھنے لگتے ہیں تو ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ذرا رکئے اباپ کو روک کر پہلے وہ بستر تہہ کرتی ہیں اور پھر فرماتی ہیں کہ اب بیٹھئے! قریش کا وہ مدبر سردار جس نے ایک دنیا دیکھ رکھی تھی اور جسے بڑے بڑے درباروں میں حاضر ہونے اور وہاں کے رکھ رکھاؤ اور آداب کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا'

فوراً پوچھتا ہے: "یہ بستر میرے لائق نہ تھا یا میں اس بستر کے لائق نہ تھا"۔ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ فرماتی ہیں کہ ابا جان آپ ابھی مشرک ہیں' ناپاک اور نجس ہیں' اور یہ بستر محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے' لہٰذا آپ اس پر نہیں بیٹھ سکتے----!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست اور معاملہ فہمی کی ایک نہایت اعلیٰ مثال یہاں بھی سامنے آتی ہے کہ آپؐ نے تجدیدِ صلح کے لئے کی جانے والی ان کوششوں کا کوئی مثبت جواب نہیں دیا اور مشرکین کے ساتھ صلح کی تجدید پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اس لئے کہ نہ جنگ آپؐ کا اصل مقصود تھی نہ صلح۔ آپؐ کی سعی و جُہد کا اصل ہدف اور مقصود تھا دین کا غلبہ---! جب اس ہدف کے حصول اور دین کی مصلحت کے لئے صلح بہتر تھی تو آنحضورؐ نے بظاہر احوال دب کر بھی صلح کرلی۔ (صلح حدیبیہ کی شرائط بالکل یکطرفہ محسوس ہوتی ہیں کہ ان سے بظاہر سارا فائدہ مشرکین کو پہنچ رہا تھا۔) لیکن اب چونکہ صلح کو مزید جاری رکھنے اور صلح کی تجدید کرنے کے معنی یہ ہوتے کہ کفر کو بلاجواز ایک مہلت (Lease of Existence) دے دی جاتی' لہٰذا آنحضورؐ نے صلح کی تجدید نہیں فرمائی۔ آپؐ صحیح طور پر اندازہ فرما چکے تھے اور جان چکے تھے کہ اب ان کفارِ قریش اور مشرکین مکہ میں کوئی قوتِ مدافعت موجود نہیں ہے۔ غلبہ و اقامتِ دین کی منزل اب بہت قریب ہے' آپؐ کی انقلابی جدوجہد اب کامیابی سے ہمکنار ہوا چاہتی ہے' لہٰذا آپؐ نے صلح کی تجدید سے انکار کیا۔

تکمیلِ انقلاب کا عنوان۔ فتح مکہ

اس کے کچھ ہی عرصے بعد رمضان مبارک ۸ھ میں آپؐ دس ہزار صحابہؓ کی معیت میں مکے کی جانب پیش قدمی فرماتے ہیں۔ اب کسی میں دم نہیں تھا کہ مسلمانوں کی قوت کے سامنے ٹھہر سکتا۔ بعض زیادہ سرپھرے اور جذباتی لوگوں کی طرف سے کچھ تھوڑی سی مزاحمت ہوئی' صرف چند جانیں تلف ہوئیں اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتح کی حیثیت سے مکے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر انبیاء کرام کی سیرت و کردار کا وہ مشترک پہلو سامنے آتا ہے کہ جس کی اس مقدس جماعت سے باہر کوئی دوسری مثال پیش

انتخابی طریقہ کار

نظام کی تبدیلی کے لئے کیوں مفید نہیں؟

ابو عمیر مہرانی

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہونے کے ناطے اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ اسلام مذہب نہیں بلکہ مکمل دین ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی جملہ گوشہ ہائے زندگی سے متعلق مخلوق کے لئے ان کے خالق کی طرف سے اعتدال اور انصاف پر مبنی رہنمائی موجود ہے۔ جیسے ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں بالکل اسی طرح کسی ملک میں ایک وقت میں دو نظام غالب نہیں رہ سکتے۔ کسی ملک میں اسلام غالب نہ ہو تو لازماً مغلوب ہو گا۔ کوئی تیسری صورت ممکن ہی نہیں۔ اور اسلام جب مغلوب ہو تو ظاہر ہے کہ خلا کا تو امکان ہی نہیں' اس لئے کوئی دوسرا نظام یا نظریہ لازماً غالب و نافذ ہو گا اور جملہ شعبہ ہائے حیات کے لئے اس نظام کے اپنے اصول' ترجیحات اور تقاضے ہوں گے جو لازماً مغلوب نظام یعنی اسلام سے متصادم ہوں گے۔ اِس وقت پوری دنیا کے مسلمان ممالک میں دوسری صورت ہی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اور تقریباً سبھی ممالک میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اس نظام کو چلانے کے لئے انتخابات کے ذریعے حکومت کی تبدیلی کا طریقہ رائج ہے۔ جن جن مسلمان ممالک میں غلبہ دین کا شعور اور امکان پیدا ہوا وہاں کی دینی جماعتوں نے مروجہ نظام کے تحت حکومت کی تبدیلی کے لئے میسر سہولت کو نظام کی تبدیلی کے ارادے سے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان کی یہ تدبیر خلوص پر مبنی ہے کہ مسلمان عوام کے دینی جذبے کو ابھار کر مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں بالآخر اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی جسے وہ "اسلامی

انقلاب" کا نام بھی دیتی ہیں۔ اس صورت حال میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ کیا نظام کی تبدیلی قریبی انسانی تاریخ میں کبھی بھی عوام کی اکثریت کے ذریعے ظہور پذیر ہوئی ہے؟

۲۔ نیز کیا متصادم نظریات پر مبنی نظام کے قواعد و ضوابط کے تحت جد و جہد کر کے اپنے مطلوبہ نظام کو غالب کیا جا سکتا ہے؟

ان میں سے جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے الحمدللہ اس کا جواب راقم اپنے گزشتہ مضمون (شائع شدہ دسمبر ۹۴ء بعنوان "نظریۂ انقلاب پر مخالفین کا طرز عمل") میں امکانی حد تک مدلل انداز میں دے چکا ہے۔ ان شاء اللہ العزیز سطورِ زیریں میں دوسرے سوال کا بھرپور جواب دینے کی ادنیٰ سی کاوش کی جائے گی۔

اسلام کے نظامِ عدل و قسط کا تعارف

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہو گا کہ اسلامی نظام کی ضرورت و اہمیت کو مختصر انداز میں بیان کر دیا جائے کہ جب اسلامی نظام کے غلبے کی بات کی جاتی ہے تو اس سے مراد کیا ہوتی ہے کیونکہ یہ بنیادی اور اہم نقطہ ذہن سے اوجھل ہو جائے تو جد و جہد کا اصل ہدف دھندلا جاتا ہے۔ دراصل قانونِ شریعت اسی وقت ثمر آور ہو سکتا ہے جبکہ اس کے سر پر اسلامی نظام کا سایہ قائم ہو۔ چونکہ قانون تو وہ ضابطہ ہے جس کے مطابق انفرادی اور اجتماعی کاروبار زندگی چلایا جاتا ہے' جبکہ نظام سے مراد وہ بنیادی اصول ہیں جن کی بنیاد پر ریاستی اور آئینی ڈھانچہ ترتیب دیا جاتا ہے۔ اسلام سیاسی میدان میں کسی فرد یا پارلیمنٹ کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی مکمل حاکمیت چاہتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے دائرے کے اندر اندر تو پارلیمنٹ جو چاہے قانون سازی کرے۔ لیکن پارلیمنٹ کا سو فیصد اتفاقِ رائے بھی اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ امور کو حلال اور حلال کردہ امور کو حرام قرار نہیں دے سکتا کیونکہ حاکمِ مطلق اللہ کی ذات ہے جبکہ پارلیمنٹ تو صرف اس کے احکام کو نافذ کرنے پر مامور ہے۔

اسی طرح اسلام نے معاشی شعبے میں دولت کو چند ہاتھوں میں گردش کراتے رہنے'

نیز انسانیت کی دنیوی و اخروی فلاح کو نقصان پہنچانے والے امور کے ذریعہ دولت کمانے سے روکا ہے' بلکہ محبت اور خبر گیری کے جذبے کی تعلیم دی ہے۔ خلفاء راشدین نے اسلام کے معاشی اصولوں کی روشنی میں زمینیں خود کاشت کرنے کو رواج دے کر غیر حاضر زمینداری کو روکا ہے کیونکہ جاگیرداری کی ایسی شکل اسلام سے ٹکراتی ہے جس میں ایک فرد محض کسی انعام کے نتیجے میں ملنے والی بے پناہ اراضی کے بل بوتے پر بغیر محنت کئے سینکڑوں محنت کش انسانوں کی کمائی پر عیش کرے اور اس دولت کو فساد پھیلانے کا ذریعہ بنائے۔

اسی طرح معاشرتی اور سماجی سطح پر اسلام طبقاتی تقسیم اور اونچ نیچ کی بجائے مساوات کا حکم دیتا ہے۔ حقوق و فرائض میں تمام شہریوں سے برابری کی بنیاد پر سلوک کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

اسلام کے ان بنیادی اصولوں کی روشنی میں ریاستی و آئینی ڈھانچہ مرتب کیا جاتا ہے۔ اسے سامنے رکھتے ہوئے اگر جائزہ لیں کہ مسلمان ممالک میں جن اصولوں کے مطابق آئین نافذ ہیں کیا وہ اسلام کے اصول اجتماعیت کے مطابق ہیں تو یقیناً جواب نفی میں ہی ملے گا کہ یہاں تو حاکمیتِ اعلیٰ پارلیمنٹ کی تسلیم کی جاتی ہے بلکہ اس پر بات تک نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح معاشی میدان میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کی بدترین صورتیں نہ صرف رائج ہیں' بلکہ انہی کی بنیاد پر حکومت و اقتدار پر قبضہ بھی مخصوص طبقات ہی کا ہوتا ہے۔ نیز اسی طرح یہاں معاشرتی سطح پر اسلامی اصولوں کے بالکل خلاف طبقاتی تقسیم پائی جاتی ہے۔ تعلیم' علاج' حتیٰ کہ عدالتوں میں بھی طبقات کے لحاظ سے سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اس صورتحال کو سامنے رکھ کر سوچیں تو بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہاں اولین ضرورت اسلامی نظام کے قیام کی ہے۔ جب بنیاد ہی اسلام سے متصادم ہے تو اچھے سے اچھا قانون بھی بے ثمر ثابت ہوگا بلکہ استحصالی طبقات کو تقویت پہنچانے کا باعث بنے گا۔

اگر تو کہیں ملکی آئینی ڈھانچہ اسلامی تعلیمات پر قائم ہو پھر تو ضرورت اس بات کی ہوگی کہ اس نظام کو بہتر انداز میں چلانے کے لئے انتخابات کے ذریعے اچھے اور اسلامی اوصاف کے حامل مسلمان منتخب کئے جائیں لیکن جہاں صورت یہ ہو' جو کہ عملاً مسلمان

ممالک میں ہے' تو اس صورتحال میں پہلے نظام کو بدلنا ہوگا تاکہ اسلامی عدل و مساوات کے اصولوں پر مبنی ریاستی ڈھانچہ تشکیل کر کے اسلامی نظام کی برکات کو عام کیا جاسکے۔

الجزائر میں سوشلزم کے باعث جاگیرداری اور سرمایہ داری جیسے طبقات نہیں تھے اور اس کے اثرات اس قدر مثبت نکلے کہ عوام کی عظیم اکثریت نے اسلامی جماعت کو زبردست پذیرائی دی۔ یہ الگ موضوع ہے کہ اس کے باوجود کامیاب جماعت کو انتظام کیوں نہ سونپا گیا۔ ان شاء اللہ آگے چل کر ان وجوہات کا جواب بھی مل جائے گا۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ صرف معاشی شعبے میں کسی درجے اسلامی اصولوں کے مشابہ صورتحال سے کس قدر مختلف نتائج مرتب ہوسکتے ہیں اور اگر پورا ریاستی ڈھانچہ اسلام کے اصولوں کی روشنی میں مرتب ہو تو پھر کیسے امن اور انصاف کی فضا قائم نہ ہوگی۔ اب اس صورتحال کو سادگی ہی کہا جائے گا جہاں ایک طرف دینی قوتیں موجودہ نظام کو باطل اور غیر اسلامی بھی ثابت کرتی ہیں جبکہ دوسری طرف اسی کے اندر رہتے ہوئے آئین و قانون کے تحت اسے بدلنے کا دعویٰ بھی کرتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس نظام کو درست سمجھنے والوں کے ساتھ اتحاد کر کے انتخابات میں حصہ لیتی اور شراکتِ اقتدار بھی کرتی ہیں۔

اسلامی اصولوں سے متصادم نظام کو بدلنے کے لئے محض سربراہ حکومت اور ارکانِ پارلیمنٹ کی تبدیلی ہی کافی نہیں بلکہ جو نظام طویل مدت سے قائم ہو اسکی حفاظت کے لئے پورے معاشرے میں انتہائی گہری اور مضبوط جڑیں پیدا ہو جاتی ہیں' ان کی موجودگی میں ایک نہیں خواہ دس حکومتیں بدلی جائیں' نظام جوں کا توں برقرار رہتا ہے۔ ان شاء اللہ سطورِ زیریں میں اسی پہلو سے گزارشات پیش کرنے کی جسارت کی جائے گی۔

طاغوتی نظام کے پشت پناہ طبقات

جس معاشرے میں سیاسی' معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے احکامات سے متصادم بنیادوں پر قائم ہو اور اسے جاری و ساری رکھنے کی جدوجہد جاری ہو قرآنی اصطلاح میں ایسا نظام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا باغی یا طاغوت کہلاتا ہے۔ ایسے سرکش معاشرے کا اجتماعی کردار' اللہ کے حضور حاضری سے

غفلت' ظلم کی حمایت' مادہ پرستی اور دولت پرستی پر مبنی بن جاتا ہے۔ ایک طویل مدت سرکشی میں گزر جانے کے باعث کچھ ایسے طبقے وجود میں آجاتے ہیں جنہیں اس سازگار ماحول نے مفادات سے نوازا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ طبقات بحیثیتِ مجموعی اس نظام کے محافظ اور پشت پناہ بن جاتے ہیں کیونکہ اب وہ نظام کی اور نظام ان کی ضرورت بن جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طاغوتی نظام کے یہ ستون پورے معاشرے میں کسی تناور درخت کی جڑوں کی مانند گہرے سے گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور ہر سطح پر اپنے محسن نظام کو چلانے والوں کے ہاتھ مضبوط کرنے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ اس طرح کسی ایسے نظام میں حکومت کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ حکومتیں تبدیل ہونے کے باوجود استحصالی چیرپھاڑ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ چونکہ نظام کے محافظ ہر نئے آنے والے کو اپنی ڈگر پر چلا لینے میں خوب مہارت رکھتے ہیں اس لئے جب تک ظلم پر مبنی اس نظام کی جڑوں کو نہ اکھاڑا جائے کسی طرح کی تبدیلی آ ہی نہیں سکتی' حتیٰ کہ کسی ولی اللہ کو بھی اگر سربراہ حکومت بنا دیا جائے تو اس نظام کے محافظ طبقات جلد ہی اسے بھی اپنے جال میں جکڑ کر پہلے سے بڑا طاغوت بنا دیتے ہیں۔ اور یہ شیطانی جال پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔

۱۔ چودھری اور وڈیرے

کسی بھی معاشرے میں طاغوتی نظام کے پشت پناہوں میں اولین اور سب سے اہم' معاشرے کا بدکردار چوہدری ہوتا ہے' جو نسل در نسل جبر و ستم کے باعث عوام پر حکمرانی کرتا رہتا ہے۔ استحصالی نظام اس طبقے کو مراعات اور اعزازات سے نواز کر اس کی مدد سے غریب عوام کو جکڑ کر رکھتا ہے۔ یہ اس نظام کے کارندوں کے ساتھ ملی بھگت سے باہمی تعاون کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ ان خدمات کے عوض نظام کی طرف سے اسے بستی یا شہر کا معزز فرد قرار دیا جاتا ہے۔ محکمۂ مال' پولیس' انتظامیہ اور سیاستدانوں کا عوام سے رابطہ اسی "معزز شہری" کی وساطت سے ہی ہوتا ہے۔ اور اسی کی تصدیق اور سفارش سے ہی محکوم عوام کے زرعی اور عدالتی معاملات کو قابل غور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی بیٹھک پر ہی غریب کسانوں کی زمینیں اِدھر سے اُدھر منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ یہ حکومتی کارندوں کے گٹھ

جوڑ سے بے بس لوگوں کو مختلف جھوٹے مقدموں میں الجھاتا ہے۔ اور پھر اپنی رعیت پر احسان دھرتے ہوئے رشوت کے بدلے مقدمے ختم کراتا ہے اور اپنا کمیشن بھی وصول کرتا ہے اور اس طرح کی عنایات کے بدلے ووٹ خود لیتا ہے یا پھر اوپر ہی اوپر سودا طے کر کے ووٹ دلانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ عوام اس کے مکروہ کردار سے آگاہ اور بیزار ہونے کے باوجود اسی کے در پر حاضری دینے اور اس کے ہتھکنڈوں سے مجبور اسے یا اسی قبیل کے افراد کو اپنے اوپر مسلط کرنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ ان غریبوں کو لاکھ وعظ و تلقین کیجئے' اس طبقے کے ظلم گن گن کر بتائیے اور صالح لوگوں کی صفات سے آگاہ کیجئے لیکن وہ ووٹ اسی طبقے کو دیں گے کیونکہ ایسا نہ کر کے ان کے لئے جائے پناہ بھی کوئی نہیں ہوتی۔ ان کے بالواسطہ اور بلاواسطہ مظالم سے عوام کو بچا بھی تو کوئی نہیں سکتا' جو ظالم غنڈوں اور ڈاکوؤں کی مدد سے سزا دلوا سکتے ہیں' مال مویشی چوری کرا سکتے ہیں' بے بس لوگوں کی بہو بیٹیوں تک کو اغوا کرا سکتے ہیں اور پولیس کی مدد سے گرفتار کرانے سے بھی نہیں چوکتے تو پھر کون جرأت کرے گا کہ ان کی مرضی سے سرتابی کر سکے۔ اگر کوئی فرد جوشِ عزیمت میں قدم اٹھا ہی بیٹھے تو اس کی آنے والی نسلیں بھی اس ظالم طبقے کے انتقام کو بھلا نہیں سکتیں۔ یہ حکومت میں ہو یا اپوزیشن میں ہر حال میں ان کی قوت قائم و برقرار رہتی ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ اس طبقے میں سے کوئی بہت بڑا اور زیادہ مؤثر ہو اور کوئی چھوٹا لیکن کیفیت کردار میں اپنے اپنے علاقے میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ آبادی ہزاروں پر مشتمل ہو یا چند نفوس ہی کیوں نہ بستے ہوں ہر آبادی میں ایسا کردار اور نظام کی کڑی ضرور موجود ہوتی ہے۔ اس طبقے کی گرفت توڑے بغیر یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی باکردار اور مخلص شخص منتخب ہو سکے۔ لیکن اگر عوام کسی جگہ کبھی ایسی غلطی کر ہی بیٹھیں تو انتظامیہ اور پولیس کی مدد سے نتائج کو ادھر سے ادھر کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔

تاریخ اسلام میں عمر ثانی کا لقب پانے والے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے خلافت کی ذمہ داری اٹھانے کے بعد سب سے پہلا کام ملوکیت کی طرف سے دی جانے والی جاگیریں اور انعامات واپس لینے کا ہی کیا تھا۔ لیکن طاغوت کی جڑوں کی پھرتی تو دیکھئے کہ انہوں نے دو سال کی قلیل مدت ہی میں اس طاغوت دشمن مجاہد کو زہر دلوا کر رستے سے ہٹا کر ہی دم لیا

کیونکہ عمرِ ثانیؒ نے ان کے مفادات کی نالیاں کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ان کا خلافت پر فائز ہونا چونکہ کسی انقلاب کی بجائے محض سابقہ خلیفہ کی نامزدگی کا نتیجہ تھا اور طاغوت کی تمام جڑیں اپنی اصل شکل میں معاشرے میں موجود تھیں اس لئے انہوں نے جلد ہی اس خدا پرست کو راہ سے ہٹا کر اپنا مکروہ دھندا دوبارہ شروع کر دیا۔ مختصراً یہ کہ جب تک کسی معاشرے میں اس چوہدری اور سردار کا کردار تمام تر خباثتوں کے ساتھ موجود ہو وہاں کسی صالح انقلاب کی توقع رکھنا جاگتے میں خواب دیکھنے کے مترادف ہی ہو گا۔

۲۔ افسر شاہی

خدا بیزار نظام کا ایک اور اہم پایہ افسر شاہی کا جال ہوتا ہے جس پر پورے نظام کا ڈھانچہ انحصار کرتا ہے۔ یہ پورے ملک کے ہر ہر شعبے میں اوپر سے نیچے تک مکڑی کے جالے کی طرح پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس طبقے میں ذاتی حیثیت میں کوئی کتنا ہی مہذب کیوں نہ ہو لیکن اس طبقے کا مجموعی کردار مغرب پرستی اور ذہنی غلامی کے اصولوں سے لیس ذاتی مفاد کے حصول' رشوت ستانی' دولت کی نمائش اور ترقیوں پر ترقیاں مارنے کی خواہشات کی تکمیل کے ہتھکنڈوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ حب الوطنی' قومی مفاد' اخلاقی اصولوں کا اس کوچے میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہاں قاعدے کے مطابق حقدار کو حق دینے کی بجائے رشوت کی لاٹھیوں سے معاملے طے ہوتے ہیں۔ ملکی ترقیاتی' تعمیراتی اور بین الاقوامی تجارتی معاہدوں میں کمیشن وصول کرنا شیرِ مادر سمجھا جاتا ہے۔ افسرِ بالا کی رضاجوئی میں عزتِ نفس اور غیرت نام کی کسی چیز کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ اپنے سے بڑے کے لئے موم کی ناک جبکہ ماتحت کے لئے لوہے کا چنا دکھائی دیتا ہے۔ صاحب اقتدار کے اشارہ پر جان چھڑکنے والا یہ طبقہ اقتدار کی محرومی پر ان کا شناسا بھی نہیں بنتا۔ ہر نئے آنے والے کو اپنی اطاعت شعاری کا یقین دلانے میں یہ کمال مہارت رکھتا ہے لیکن چند ہی دنوں میں اسے اپنی ڈگر پر چلا لینے کا فن تو گویا اس کا اصل جوہر ہے۔ جو حکمران ان کی مرضی پر صاف صاف نہ چلے تو آج نہیں تو کل اسے اقتدار سے رخصت ہونا ہی پڑتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں متبادل قیادت کے ساتھ پہلے ہی سے معاملات و شرائط طے کرنے میں یہ طبقہ ہرگز تاخیر نہیں

کرتا۔

اگر کوئی افسر ایمان کے "ہیضے" کے باعث مجموعی مزاج پر نہ چل سکے تو یہ ظالم طبقہ اسے مدتِ ملازمت قید بامشقت کے انداز میں گزارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جب تک یہ مکروہ جال اپنی اصل شکل میں برقرار ہے کیسے ممکن ہے کہ دین حق کو غالب کیا جا سکے۔

۳۔ سرمایہ دار طبقہ

دولت پرست سرمایہ دار طبقہ بھی طاغوتی نظام کا وظیفہ خوار اور مضبوط محافظ ہوتا ہے' اس لئے کہ جو لوگ کسی ایسے نظام میں دولت جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں : یا تو وہ اس نظام کے چہیتے ہوتے ہیں یا پھر انہیں اس نظام کے معاشی اصول راس آ جاتے ہیں جس کے باعث برسات میں اگنے والی خودرو جڑی بوٹیوں کی مانند ان کے کارخانوں اور تجارتی اداروں کی تعداد دیکھتے ہی دیکھتے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے یہ طبقہ آخر کیوں ایسا چاہے گا کہ ان کی پرورش کرنے والا نظام ختم ہو کر ان کی صنعتی و تجارتی بربادی کی راہ ہموار کرے' کیونکہ دولت اور اس کی آسائشوں کا چسکا جس کو لگ جائے تو وہ اخلاق و ایمان تو قربان کر سکتا ہے لیکن کسی بھی طرح اس عروج کو نہیں چھوڑ سکتا بلکہ وہ تو اس کی ہوس میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے خدا' رسولؐ' آخرت اور شریعت جیسی حقیقتیں محض الفاظ کی حیثیت اختیار کر کے رہ جاتی ہیں۔ اسے تو ہر آن اس کاروبار کو بڑھانے' مدمقابل کو مات کرنے' کم لاگت لگا کر زیادہ سے زیادہ نفع بخش مصنوعات بنانے' حکومت کے برائے نام قوانین سے بچنے کی تدابیر سوچنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ تو معاشرتی تعلقات اور رشتوں کے لین دین میں بھی کاروبار کی وسعت کے امکانات کے علاوہ کسی شے کو مدنظر نہیں رکھتا اور اسی جمع تفریق اور ضرب و تقسیم میں ایک دن ہارٹ اٹیک یا کسی حادثے کے باعث دنیا سے کوچ کر کے اپنی اگلی نسل کو اسی دھندے میں الجھا کر قصہ ماضی بن جاتا ہے اور اس طرح اللہ اور اس کے رسولؐ سے دوری کا یہ سانا اور بھیانک جال پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔ غور کیجئے جس شخص کے لئے اس کا کاروبار اس قدر اہم ہو وہ اس سونے کے انڈے دینے والی مرغی کی مانند نظام کو

بھلا کیوں بکھرنے دے گا جس نے اسے آسان ترین شرائط پر سودی قرضے کی فراہمی اور معاف کرا لینے کے چور دروازے' سٹہ' ایڈوانس ٹریڈنگ اور ٹیکسوں کی ادائیگی کی بجائے معمولی رشوت کے بدلے بچ نکلنے جیسے بے شمار سلسلہ ہائے تعاون مہیا کر رکھے ہوں۔ بلکہ وہ تو امکان بھر اس نظام کی حفاظت کو اپنا مقدس فرض سمجھے گا کیونکہ ایسے نظام کا خاتمہ دولت کے پجاری کے لئے موت کا پروانہ ثابت ہو گا۔ بالفرض کبھی اس کے محبوب نظام کو خطرہ محسوس ہو تو یہ مصنوعی معاشی بحران پیدا کر کے ناسازگار ماحول کو بدلنا خوب جانتا ہے۔ وہ اس "کارِ خیر" میں اکیلا تو ہوتا نہیں بلکہ اس جیسے دوسرے وظیفہ خوار طبقے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس نظام کا دفاع کر سکتے ہیں۔ دولت کا یہ سانپ زکوٰۃ اور خیرات کا تو کوئی تصور ہی نہیں رکھتا' البتہ ضرورت پڑنے پر انتخابی مہم کا رخ بدلنے کے لئے یہ تجوریوں کے منہ کھول دیتا ہے کیونکہ نظام قائم رہا تو دولت کئی گنا آ ہی جائے گی لیکن اگر اسی کو خطرات لاحق ہو گئے پھر تو یہ جیتے جی مر جائے گا۔ معاشی استحصال پر مبنی نظام کا یہ اہم پایہ وہ بھاری پتھر ہے جسے راہ سے ہٹائے بغیر اسلامی بنیادوں پر مبنی نظام عدل کسی صورت قائم نہیں کیا جا سکتا' اس لئے کہ اسلام جو معاشی اصول نافذ کرنا چاہتا ہے اس میں سرمایہ کاری کا مقصد فلاح انسانیت ہوتا ہے' عوام کے استحصال اور بے جا وسائل کی مدد سے مخصوص طبقات کی پرورش کرنا اسلام گوارا نہیں کرتا جبکہ اپنے مفادات پر آنچ آنے دینا ان طبقات کو گوارا نہیں ہوتا تو پھر یہ ایسے نظام کو کیونکر خوش آمدید کہیں گے۔

۴۔ حرام خور تاجر

اسی قبیل کا ایک دوسرا طبقہ ہے جو حجم کے لحاظ سے تو چھوٹا ہوتا ہے لیکن خباثت کے لحاظ سے اس طبقے کے بالکل ہم پلہ ہوتا ہے۔ ہماری مراد منافع خور اور ذخیرہ اندوز تاجر طبقے سے ہے جو اسی استحصالی نظام کے طفیل پھلتا پھولتا ہے اور اس طرح اس کی مضبوط جڑ کا کردار ادا کرتا ہے۔ اشیاء خوردنی تک میں پتھر اور نہ جانے کیا کیا پیس کر دولت کے انبار لگانے کا خواہش مند یہ طبقہ بلیک مارکیٹنگ اور ذخیرہ اندوزی جیسے ہتھکنڈوں سے مصنوعی قلت اور مہنگائی پیدا کر کے مارکیٹ کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ بدکردار سیاستدانوں کا پشت پناہ

اور راشی انتظامیہ کا بھی خواہ ہوتا ہے۔ یہ دوہرے حسابات رکھ کر سرکاری خزانے میں اپنا جائز حصہ ادا کرنے کی بجائے رشوت سے کام چلاتا ہے۔ انتظامیہ کی خدمت میں گھی کے ٹین اور دیگر تحائف پیش کر کے کسی باز پرس سے بے پرواہ ہو کر اپنے انسانیت کش دھندے کو پھیلانے میں مگن رہتا ہے' جبکہ انتخابی مہموں کے دوران دیگیں تقسیم کر کے اور فنڈز مہیا کر کے یہ سیاسی گروہوں کو بھی ہم خیال رکھنا خوب جانتا ہے۔ اور اسی لئے حکومت کو کبھی عوام کے دکھاوے کے لئے ملاوٹ کے خلاف مہم چلانی ہی پڑ جائے تو یہ اس سے صاف بچ نکلتا ہے لیکن اگر کسی مصلحت کے تحت پکڑا ہی جائے تو چند گھنٹوں ہی میں باہمی تعاون کے عوض باعزت چھوٹ جاتا ہے اور انسانیت سوز کام میں دوبارہ مگن ہو جاتا ہے۔ راتوں رات دولت مند بننا ہی اس کا مقصدِ زندگی ہوتا ہے۔ اسے یہ احساس کبھی نہیں ستاتا کہ جس قوم کو جسمانی اور مالی طور پر وہ تباہ و برباد کر رہا ہے وہ خود بھی اسی قوم کا فرد ہے بلکہ درحقیقت اس کے نزدیک قوم' وطن' دین اور اخلاق کی کچھ اہمیت نہیں ہوتی۔

ایسا ننگِ انسانیت گروہ معاشرے میں اپنی اصل صورت میں موجود رہے تو کسی صالح انقلاب کے آجانے کی توقع رکھنا سراب کے پیچھے بھاگنے کے مترادف ہوتا ہے۔

۵ - سیاسی موقع پرست

پیشہ ور سیاسی موقع پرست بھی طاغوتی نظام کے بہت بڑے محافظ ہوتے ہیں۔ یہ اسی نظام کی پیداوار ہوتے ہیں اور اس کا جاری رکھنا ہی ان کی مجبوری اور ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح گندے پانی کے جوہڑ میں غلیظ کیڑے مکوڑے پیدا ہو کر پھلتے پھولتے ہیں بالکل اسی طرح مغرب کی بدکردار جمہوریت کسی معاشرے میں رچ بس کر موقع پرست سیاستدان پیدا کر دیتی ہے۔ ان کا پیشہ ہی سیاست بازی ہوتا ہے۔ استحصالی نظام کو جتنی طویل ڈھیل ملی رہے اس گروہ میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ سیاسی بحران پیدا کرنا' اپنی قیمت وصول کرنے کے لئے نمائشی تحریکیں چلانا اور ہمیشہ جوڑ توڑ میں مصروف رہنا اس گروہ کے ہتھیار ہوتے ہیں۔ اس طبقے کی عوام میں پذیرائی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے لیکن افسر شاہی اور ایجنسیوں کے مفادات کا تحفظ کرتے رہنے کے باعث یہ لوگ میدانِ سیاست میں "قومی

سیاستدان" بنے رہتے ہیں۔ معاشرے میں کسی حقیقی تبدیلی کا لانا نہ تو ان کا مقصد ہوتا ہے اور نہ ہی ضرورت' بلکہ وقت کے حکمران سے اپنا حصہ وصول کرنے کے لئے یہ ہر بار نئے نئے روپ بدل کر سامنے آتے ہیں۔ وفاداریاں بدلنا اس گروہ کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔

حالات کے ستائے ہوئے عوام اگر کسی ایسے گروہ کی طرف متوجہ ہو جائیں جو ان کے حالات بدلنے کا نعرہ لگا رہا ہو تو اس نظام کے محافظ طبقات کی طرف سے اشارہ پاتے ہی یہ اس گروہ میں شامل ہو کر "مخلص قائدین" بن جاتے ہیں' اس لئے کہ کسی نظریاتی اور عملی تفریق کے بغیر ہر کسی کو خوش آمدید کہنا دراصل انتخابی معرکہ جیتنے کے خواہشمند گروہ کی مجبوری ہوتی ہے۔ اور یہی مجبوری اس راہ کی اصل رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ اگر کسی کو ووٹ حاصل کرنے اور کامیابی کی راہ ہموار کرنے والے طبقات پر کردار و عمل کی قید لگانی ہو تو ہم

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں!

طاغوتی نظام کے محافظ طبقات کی کوشش کے بغیر اگر اس بات کے امکانات ہوں کہ تحریک جزوی طور پر کامیاب ہو سکتی ہے تو یہ گروہ تحریک کی قیادت کو ورغلا کر مذاکرات کی میز پر لا بٹھاتا ہے۔ اور کسی سبب ایسا نہ کر پائے تو اپنے کارندوں کی مدد سے اس تحریک کا رخ توڑ پھوڑ کی طرف موڑ کر طاغوتی قوتوں کو موقع فراہم کر دیتا ہے کہ وہ اس تحریک کو کچل کر رکھ دیں۔ گویا ہر ہتھکنڈے سے یہ اپنے محسن نظام کو بچا لیتا ہے۔ جب تک مغربی جمہوریت کا نظام سودی معیشت کے بل بوتے پر سرمایہ داری اور جاگیرداری کے پہیوں پر سوار کسی معاشرے میں موجود رہتا ہے یہ طبقہ اپنے مکروہ ہتھکنڈوں کے باعث اس ظالمانہ نظام کے ہاتھ مضبوط کرتا رہتا ہے۔ اسے حکومتوں کے بدلنے سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ جو بھی برسر اقتدار آجائے یہ اس کا ہمنوا بن جاتا ہے۔ اس کے ترکش میں بے پناہ تیر ہوتے ہیں بلکہ اس نظام کے دوسرے مضبوط ستون اس کے پشت پناہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کا کردار کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ طبقہ اپنے تمام تر گھناؤنے کردار کے ساتھ میدان میں موجود بھی ہو اور صالح نظریات کی حامل حکومت قائم ہو جائے' اسے خواب تو کہا جا سکتا ہے حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔

۶ ۔ زرد صحافت

غیر منصفانہ نظام اور اس کے فطری محافظوں کے جرائم پر پردہ ڈالنے اور عوام کے سامنے انہیں ہمدرد اور محبِ وطن کے روپ میں پیش کرنا بھی دراصل طاغوتی نظام کی بہت بڑی خدمت ہوتی ہے اور یہ کام اخبارات' رسائل اور شعروادب کے حلقوں میں سے وہ طبقہ کرتا ہے جسے عرف عام میں زرد صحافت کہا جاتا ہے۔ یہ ضمیر فروش طبقہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کر پیش کرنے میں مہارت رکھتا ہے۔ اس کا کام اپنے محسن کے مخالفین کی کردار کشی کرنا جبکہ خود اس کی بد عملیوں کو انسان دوستی بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس شعبے میں بہتان تراشی' جھوٹ اور غیبت کو دیدہ دلیری سے بطور ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے۔ استحصالی طبقات میں سے جو بھی سربراہی پر فائز ہو جائے یہ اسے عمرؒ بن عبدالعزیز اور صلاح الدین ایوبیؒ ثابت کرنے کے لئے تمام صلاحیتیں کھپا دیتا ہے اور اس طرح اسے عوام کے دل و دماغ پر مسلط کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ یہ اس کی نیکی کے چرچے کرتا اور اس کی شاہ خرچیوں کو سخاوت بتاتا ہے' جبکہ اس کی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالتا رہتا ہے۔ دوسری طرف اگر کوئی اس نظام کی حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرے تو اسے ذرائع ابلاغ کے صفحات پر جگہ نہیں ملتی۔ جبکہ ریڈیو ٹی وی تو مکمل طور پر اس نظام کے خالصتاً ذاتی استعمال میں ہوتے ہیں۔ نظام کے نظریات سے ہم آہنگ تحریر خواہ کتنی بے دلیل اور بودی کیوں نہ ہو یہ اسے نمایاں طور پر شائع کرتا ہے جبکہ انسانی فلاح کے نظریئے پر مبنی کتنی ہی مدلل تحریر کیوں نہ ہو یہ طبقہ اسے ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیتا ہے۔ اختلافی پہلو سے بھی صرف اسی نقطۂ نظر کو ابھارا جاتا ہے جس کی اصلاح سے یہ نظام مزید بہتر انداز میں چل سکے۔ اسی نظام کے محافظ متحارب سیاسی گروہوں میں سے کسی نہ کسی کی پشت پناہی کر کے یہ طبقہ عملاً نظامِ طاغوت کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔ یہ نظام کے مختلف شعبوں کی خامیوں پر لکھتا بھی ہے تو محض اپنے کام نکلوانے کے لئے۔

اسی طرح اس نظام کو موافق آنے والے تمام امور مثلاً سودی معیشت' عریانی اور فحاشی' مغربی طرز کی آزادئ نسواں' جوئے پر مبنی انعامی سکیمیں' اخلاق سوز افسانے اور

جمہوریت کی برکات وغیرہ کو خوب خوب پھیلا کر وفاداری بشرطِ استواری کا عملی ثبوت دیتا ہے۔ وقفے وقفے سے نظام بچانے کے مشورے دیتے رہنا بھی یہ طبقہ اپنا فرض اولین سمجھتا ہے۔ نظام کے مظالم سے ستائے ہوئے عوام میں پیدا ہونے والے ردعمل کو یہ طبقہ بڑی چابکدستی سے حکومت کی تبدیلی کی طرف موڑ دیتا ہے تاکہ کردار بے شک بدل جائیں نظام جوں کا توں رہے۔ مظلوم عوام ان کی چالوں میں پھنس کر بدستور لٹتے رہنے پر مجبور رہتے ہیں۔ اس طرح عوام میں سے غور و فکر کرنے والی اقلیت بھی ان طبقات کی طرف سے پیدا کردہ الجھاؤ کے باعث نظام بدلنے کی ضرورت پر غور کرنے اور قوت مجتمع کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ البتہ عوام کی اکثریت کا مزاج پوری تاریخ انسانی کے دوران یہی رہا ہے کہ جو غالب آجائے اسے برداشت کر کے حالات سے سمجھوتہ کئے رکھیں۔ خواہ ایک ایک لقمے کو ترستے رہیں لیکن ظالم کے خلاف اٹھنا ان کے بس ہی میں نہیں ہوتا۔ ہاں کوئی دوسرا گروہ قربانیاں دے کر طاغوت کو گرانے میں کامیاب ہو جائے تو عملاً اس کے حامی ہو جاتے ہیں کیونکہ دلی طور پر تو یہ طبقہ ظلم سے بیزار اور عدل کا منتظر ہوتا ہے۔

لیکن یہ زرد صحافت اس پُرعزیمت اقلیت کو بھی ضمنی معاملات میں الجھا کر اصل ہدف سے دور رکھنے میں کوشاں رہتی ہے۔ یہ صحافی موقع پرست سیاست بازوں کو اخبارات میں زندہ رکھ کر قومی سیاستدان بنائے رکھتے ہیں۔ اسی طرح وقفے وقفے سے اسلام کے حوالے سے کوئی ایسا چٹکلہ چھوڑ دیتے ہیں جس پر مغرب نواز نام نہاد دانشوروں کو دل بھڑاس نکالنے کا موقع میسر آجاتا ہے۔ اور اس طرح سادہ ذہن اور دین کی واجبی سوجھ بوجھ کے حامل مخلص عوام کو ذہنی انتشار اور دینی حلقوں سے دور رکھ کر یہ طبقہ عملاً لادینیت اور طاغوت کے ہاتھ مضبوط کرتا رہتا ہے۔ گویا زرد صحافت نظامِ طاغوت کا وہ مضبوط کھونٹا ہے جو اس نظام کے محافظوں کی نہ صرف سرپرستی کرتا ہے بلکہ کسی بند کمرے میں بیٹھ کر اپنے مکر و فریب کے باعث سب سے زیادہ مؤثر و توانا محافظ ثابت ہوتا ہے۔ جب تک اس طبقے کو کھلی چھٹی ملی رہے تو کس طرح دین حق کو قائم کرنے کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔

۷۔ دنیادار علماء و مشائخ

اسی طرح دنیادار علماء اور مشائخ کا طبقہ بھی ایسے نظام کا محافظ ثابت ہوتا ہے۔ لفظ عالِم سے دھوکا نہ کھانا چاہئے کیونکہ خود حضور ﷺ (وھو الصادق المصدوق) نے علماءِ حق اور علماءِ سُو کی تقسیم بیان فرما کر ایسے کردار کی نشان دہی فرمادی تھی۔ یہاں ہماری مراد وہ علماء و مشائخ ہیں جو دین کے کام کو ایک پیشہ اور دنیا کمانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ طبقہ مسلمانوں کی قوت کو کمزور کرنے کے لئے نئے نئے مسلک بنا کر انہیں باہم لڑاتا ہے اور انہیں دین کی حقیقی تعلیمات سے دور رکھتا ہے۔ یہ دین کی بجائے مسلک کی دعوت پھیلاتا ہے۔ اپنے مسلک کے لئے الگ مسجدیں بنانا اور دوسرے مسالک کی مساجد پر قبضہ کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ یہ طبقہ مساجد' مدارس اور خانقاہوں کے نام پر چندہ وصول کرتے ہوئے' دینے والے کے ذریعہ آمدن کے حلال یا حرام ہونے کی قطعاً پرواہ نہیں کرتا۔ یہ اپنے مسلک اور سلسلہ کو مومن اور جنتی ہونے کے سرٹیفکیٹ جاری کر کے بے عملی کو تقویت دیتا ہے جبکہ دوسروں کے لئے یہ کفر کے فتوے جاری کرتا ہے۔ گویا یہ دین کے نام پر دین کی راہ روکنے والا طبقہ ہے۔ حاکمِ وقت کی قربت مل جانے پر اس کے مکروہ کردار سے صرفِ نظر کرنا اور مدارس کے لئے مالی امداد کے عوض اُسے اپنے دور کی عظیم اصلاحی شخصیت قرار دینا اس طبقے کا معمول ہے۔

گویا علماءِ سو کا یہ طبقہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اس قول مبارک کی عملی تصویر نظر آتا ہے کہ "اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو' نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو"۔

غرض یہ طبقہ مذہب کے نام پر لوگوں کو ٹکڑوں میں بانٹ کر اور دین کے حقیقی تقاضوں سے روشناس نہ کرا کر لادینی نظام کی عمر بڑھانے کا باعث بنتا ہے۔ گویا یہ ایسے نظام کا بہت ہی مضبوط محافظ ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام اس طبقے کے گھناؤنے کردار سے بھری پڑی ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ' حضرت امام احمدؒ بن حنبل' حضرت امام مالکؒ کے خلاف حاکمِ وقت کی خواہش پر فتوے دینے والے ایسے ہی علماءِ سو تھے۔ اور حضرت مجددؒ الف ثانی'

امام شاہ ولیؒ اللہ اور سید احمدؒ شہید کے خلاف کفر اور قتل کر دینے کے فتوے دینے والے بھی یہی لوگ تھے۔ اور یہ سب کچھ دین بیزار قوتوں کی طرف سے ان کو تھوڑے سے مال یعنی ہدیہ پیش کرنے کے عوض ہوتا رہا ہے۔ تو کیا اب یہ کردار دنیا سے ختم ہو گیا ہے؟ کیا اپنے نام کے ساتھ علامہ اور مولانا لکھنے والے لادینیت کے محافظ حکمرانوں کو قرآن کی تاویلوں پر مبنی دلائل فراہم نہیں کرتے اور میڈیا میں ان کی دین دوستی کے حق میں تعریفوں کے پل نہیں باندھتے؟ اور کیا عوام کی حقیقی دینی کردار سازی کئے بغیر محض ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر ووٹ حاصل کرنے والی دینی قوتوں کے راستے میں یہ لوگ رکاوٹ نہیں بنیں گے؟ اس گروہ کا زور توڑے بغیر نظام کی تبدیلی کی خواہش ایک ڈراؤنا خواب ہی ثابت ہو سکتا ہے۔

۸ ـ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت

مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے ماہرین معیشت بھی ایسے طاغوتی نظام کا مضبوط ترین پایہ ہوتے ہیں کیونکہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بنیاد الحاد پر ہے جہاں مادہ ہی فیصلہ کن عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نظام معیشت میں رزاق کی کوئی اہمیت و کردار نہیں۔ معاشی ترقی کے لئے ڈیمانڈ اور سپلائی کو مدنظر رکھتے ہوئے اصول وضع کئے جاتے ہیں جن میں کسی مذہب' خدا اور آخرت کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ انفرادی نفع رسانی ہی اس نظامِ معیشت کی بنیاد ہے' اس لئے سود' جوا' سٹہ' حتیٰ کہ دولت کمانے کا ہر پُرکشش ذریعہ اس نظام میں سنہری اصولوں کی حیثیت رکھتے ہیں خواہ اس کے اثرات سے عوام کے اخلاق و کردار کا دیوالیہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

اس نظام کے ماہرین جب کسی پسماندہ اور مسلمان ملک میں لادینی نظام کے کارندے بن کر کام کرتے ہیں تو قوم کو الفاظ کے گورکھ دھندوں میں الجھا کر یورپی اصولِ معیشت پر عمل کر کے ہی صنعتی و سماجی ترقی کے خواب دکھاتے ہیں۔ نیز درآمد و برآمد کی ایسی پالیسیاں مرتب کرتے ہیں جو بیرونی بھیک کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتیں۔ یہ ماہرین آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے اثر و نفوذ کو گہرا کرنے کے لئے راہ ہموار کر کے قوم کو یہودی سازش کا شکار

بناتے ہیں۔ نتیجتاً قوم بتدریج قرضوں کی دلدل میں دھنستی چلی جاتی ہے۔ اور اس معاشی چنگل کے باعث ڈھور ڈنگروں کی سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح قوم کی عظیم اکثریت لدّو بیل بلکہ معاشی حیوان بن کر دین سے دور ہوتی ہوتی تباہ کن اخلاق و کردار کی دلدادہ ہو جاتی ہے۔ ایسے ماہرین دراصل دشمن کی جونکیں ہیں جو مسلمان معاشروں سے چمٹ کر نہ صرف انہیں معاشی طور پر کھوکھلا کر دیتی ہیں بلکہ مادہ پرستی کی روش پر لگا کر بتدریج انہیں دولتِ ایمان سے بھی محروم کر دیتی ہیں۔ اس لئے جب تک اپنوں کے روپ میں غیروں کے مفادات کا نگہبان یہ طبقہ ملک میں پالیسی ساز منصب پر فائز ہو کیسے ممکن ہے کہ قوم کی گنتی "دو اور دو' چار روٹی" کی گنتی سے باہر نکل کر اخروی فلاح کا بھی سوچ سکے۔ اس لئے ان کی موجودگی میں صالح لوگوں کا برسر اقتدار آ کر حالات بدلنے کے قابل ہونے کے امکانات ہی نہیں ہیں۔

۹۔ فرسودہ نظامِ تعلیم

اسی طرح لادینی نظام کے محافظ شعبوں میں نظام تعلیم بھی شامل ہے جو اس کی براہ راست حفاظت کی بجائے اس نظام کو مسلسل تازہ اور معیاری غذا پہنچانے کا باعث بنتا ہے۔ یہی وہ شعبہ ہے جس کی منصوبہ بندی اور پالیسیوں کے تحت نئی نسل کے بارے میں طے کیا جاتا ہے کہ ان کی ذہن سازی کن اصولوں اور ضروریات کو سامنے رکھ کر کی جانی ہے۔ ظاہر ہے کہ دین بیزار نظریات پر قائم نظام اور مغربی ذہن کے حامل ماہرین تعلیم کا بنایا ہوا نصاب وہی مقاصد پورے کرے گا جو اس نظام کے موافق ہوں گے۔ طبقاتی نظام تعلیم ایک طرف تو محدود اقلیتی طبقات میں سے حکمرانی کے جملہ شعبوں کے لئے مطلوبہ کردار' ذہن اور تہذیب کے حامل نوجوان تیار کر کے اس نظام کے تحفظ کا باعث بن رہا ہے جبکہ دوسری طرف عظیم اکثریت کے لئے اسلاف بیزار اور ذہنی مرعوبیت پر مبنی نصاب کے ذریعے ذہنی انتشار اور الجھاؤ پیدا کر کے حالات سے سمجھوتہ کرنے والا کردار پیدا کیا جا رہا ہے' جنہیں آگے چل کر عملی زندگی میں غیر منصفانہ معاشی نظام کے باعث کولہو کا بیل بنا کر مثبت سوچ و نظریات سے ویسے بھی بیگانہ کر دیا جاتا ہے۔ جب ذہن سماجی اور معاشی مسائل ہی میں الجھا

رہے تو باعزیمت سوچ کیسے پیدا ہو سکے گی۔

☆ ☆ ☆

ان حقائق کو سامنے رکھ کر یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ نظام باطل کو چلانا اور قائم رکھنا محض سربراہ حکومت اور ارکان پارلیمنٹ کا ہی کرشمہ نہیں ہوتا بلکہ اس نظام کے پیدا کردہ حالات کے باعث پھلنے پھولنے والے طبقات پورے ملکی معاشرے میں مضبوط اور گہری جڑوں کی مانند دور دور تک پھیلے ہوتے ہیں' جن میں سے چند نمایاں جڑوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ اور اس طرح کے دیگر محافظ باہم مربوط بھی ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے تعاون سے ہی استحصال کا یہ دھندا جاری رکھا جاتا ہے۔ سبھی ایک زنجیر کی مانند اپنے اپنے مفادات کی خاطر ایک دوسرے کے ممد و معاون بنتے ہیں۔ ان سہاروں اور مضبوط جڑوں کے بل پر دورِ حاضر میں مسلمان ممالک میں طاغوتی نظام رائج اور نافذ ہوتے ہیں۔ ان کی اس مضبوط گرفت کو توڑے بغیر ممکن ہی نہیں کہ عوام الناس اپنی آزادانہ رائے کو اس نظام کے مخالف کے حق میں استعمال کر کے انہیں نفاذ دین کا موقع دیں۔ اگرچہ اس بات کا تو قطعاً امکان ہی نہیں کہ دینی قوتیں خالصتاً دو تہائی اکثریت حاصل کریں اور برسر اقتدار آ کر بنیادی تبدیلی کے قابل ہو سکیں البتہ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ عملاً موجودہ نظام کی حامی جماعت یا جماعتوں کے اتحاد نیز طاغوت کی ان جڑوں کے جزوی تعاون کے باعث مخلوط حکومت بن جائے جس میں بلاشبہ دینی جماعتوں کے ارکان کی تعداد پچیس تیس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی اور پھر حسن اتفاق سے کسی دینی اور مخلص شخصیت کو اس مخلوط حکومت کی سربراہی پر فائز کر دیا جائے تو چونکہ طاغوتی نظام کے ستون اپنی اصل شکل اور قوت میں میدان میں موجود ہوں گے اس لئے چند ہی ماہ میں یہ جڑیں جب اپنی خوراک کی نالیوں سے اس خدا پرست کو وابستہ کر کے اسے اس طرح اپنے رنگ میں رنگ لیں گی کہ اب وہ ان کی آنکھ سے دیکھنا' انکے کان سے سننا اور ان کے دماغ سے سوچنا شروع کر دے گا۔ اور جسے ملت نے بڑی امنگوں کے ساتھ اس مسند پر پہنچایا تھا شیطان کی طرح یہ طاغوتی جڑیں اس کے خون تک میں سرایت کر کے اسے اپنی منزل سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ اپنے خیر خواہوں سے

عداوت پر مائل کردیں گی۔ یہ کیفیات محض تصوراتی ہی نہیں بلکہ اس سے ملتی جلتی صورت حال ماضی قریب میں اپنے ملک میں اسلام کے نام پر بننے والی حکومت کے سربراہ کے طرز عمل میں دیکھ سکتی ہے۔ نیز افغانستان میں اس کیفیت کا مشاہدہ روس کے انخلا کے فوراً بعد بننے والی حکومت کے سربراہ اور موجودہ سربراہ کے طرز عمل میں کیا جا سکتا ہے۔ جو اعتراضات اور شکایات آج برہان الدین ربانی صاحب پر کئے جاتے ہیں بالکل یہی شکایات ربانی صاحب سمیت تمام مجاہد قائدین کو جناب صبغت اللہ مجددی صاحب سے اُس وقت تھیں تو قدرِ مشترک کیا ہوئی؟ یہی نا کہ حکومت ضرور ختم ہو گئی تھی لیکن انتظامیہ سمیت تمام محافظ نظام اسی طرح موجود تھے' اس لئے انہوں نے مختصر سی مدت میں صاحب اقتدار کو اپنے ان ہمدردوں سے کاٹ دیا جو دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

اس لئے تدریجی اور اصلاحی عمل سے انقلاب ہرگز نہیں آ سکتا۔ انقلاب نام ہی مکمل تبدیلی کا ہے یعنی نیچے سے اوپر تک پورا ڈھانچہ تلپٹ ہو جائے۔ اب ظاہر ہے انقلاب کے اپنے تقاضے ہیں' جبکہ اصلاح کا عمل ٹاٹ میں مخمل کا پیوند لگانے کے مترادف ہے۔ جیسے ہماری کچھ دینی جماعتوں کا خیال ہے کہ ہمیں تیس چالیس ارکان بھی میسر آ جائیں تو ہم حکومت کو غلط سمت میں چلنے نہیں دیں گے۔ دراصل یہ اصلاح کا عمل نظام کی زندگی بڑھانے کا باعث بنتا ہے۔ جب تک جاگیرداری اور سرمایہ داری کے مضبوط مراکزِ قوت نہ ٹوٹیں آپ زیادہ سے زیادہ جزوی اصلاحی قوانین ہی بنوا سکتے ہیں۔ جبکہ عام آدمی تک عدل' انصاف اور خوشحالی کے دروازے تینوں اجتماعی شعبوں (سیاسی' معاشی اور سماجی) میں بنیادی اسلامی اصولوں کے مطابق تبدیلی کئے بغیر کھل ہی نہیں سکتے۔ تو یہ جزوی اصلاح موجودہ نظام کی عمر بڑھانے کا باعث ہی بنے گی کیونکہ ان قوانین کے باعث جزوی خوبیاں پیدا ہو جائیں گی جس سے یہ نظام مزید پھلے پھولے گا۔ اصلاح کا عمل تباہی کی طرف جانے والی گاڑی کی سپیڈ کم کرنے کا باعث تو بن سکتا ہے لیکن اس سے گاڑی کا رخ ہرگز نہیں بدلا جا سکتا۔ جبکہ نظام بدلنے کے لئے تو رخ کی مکمل تبدیلی کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی!

جی ہاں، ظلم و جبر سے نجات اور اسلام کے حقیقی نظام کے قیام کے لئے سوائے انقلاب کے کوئی اور حل ہے ہی نہیں اور انقلاب واقعتاً انقلاب ہونا چاہئے جس میں فرد کی سوچ سے لے کر تمام شعبہ ہائے زندگی میں مکمل اور واضح تبدیلی دشمنوں کو بھی نظر آئے اور ظاہر ہے یہ ایک طویل اور صبر آزما جد وجہد کے بغیر ممکن ہی نہیں اور اس کے لئے اولین کام تو قریہ قریہ پھیل کر افراد ملت کی کردار سازی کا کرنا ہوگا۔ قرآن و سنت کا مقناطیس لے کر کوچہ کوچہ پھرنا ہوگا تاکہ اصحاب عزیمت اس مقناطیس کی طرف کھنچتے چلے آئیں۔ اس طرح کی منظم اقلیت تیار ہو جائے تو انقلاب ان شاء اللہ دور نہیں رہے گا۔ اگر پہلے بھی ہادی برحق رہبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کامل اور خلق عظیم کی تصویر کو بھی اس جاں نثاری کے لئے اقلیت ہی میسر آئی تھی تو آج بھی یہ اصول بدل نہیں سکتا۔ لیکن اولین کام مردان عزیمت کی تلاش اور ان کی خالص اسلامی انقلابی تربیت کرنے ہی کا ہوگا کیونکہ۔

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں کہ یہ چار سو بدل جائے

تاکہ اس تربیت سے وہ دین حق کے غلبے کے لئے منظم ہو کر تن من دھن لگانے کے لئے بے تاب ہو جائیں۔ یہ کام جذبات ابھارنے سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے مستقل مزاجی سے محنت اور تربیت کی ضرورت ہے، تاکہ جوں جوں دعوت پھیلتی چلی جائے انہیں ایک منظم اور مربوط لڑی میں پرویا جاتا رہے۔ دراصل منتشر افراد کے جذبات کو ابھار کر توڑ پھوڑ تو کرائی جا سکتی ہے، کسی سربراہ حکومت کی ٹانگ گھسیٹ کر کسی نئے اور تازہ دم فرد کو استحصال کا موقع تو فراہم کیا جا سکتا ہے لیکن مثبت کام نہیں کیا جا سکتا۔ اور صبر اور مستقل مزاجی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب دل کی گہرائیوں سے یہ یقین ہو کہ ہم اپنی تمام استعداد کھپا کر بھی بھرپور کوشش ہی کر سکتے ہیں، نتائج پر ہمیں اختیار نہیں۔ بلکہ وہ تو مکمل طور پر علی کل شیء قدیر ذات ہی کے اختیار میں ہے۔ جب تک وہ نہ چاہے ہم

اپنی الٹی سیدھی تدبیروں سے دین غالب نہیں کر سکتے۔ ہماری ذمہ داری تو صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم اس راہ میں محض زبانی کلامی نہیں بلکہ عملاً اپنا سب کچھ کھپا دیں۔ اور ہم سے جو ابد ہی بھی اس کوشش ہی کی ہوگی۔ جب تک ہم آخری نتائج اللہ تعالیٰ کے سپرد نہیں کریں گے یونہی ٹھوکریں کھاتے رہیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے چاہے بغیر ایک پتا تک نہیں ہل سکتا تو کیا انقلاب اس کے چاہے بغیر ہم لا سکتے ہیں؟ یقیناً انقلاب اسی وقت آئے گا جب اللہ تعالیٰ کی نصرت و فتح شامل حال ہوگی۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ کی نصرت "مقام بدر" پیدا کرنے ہی سے ملا کرتی ہے۔

اس لئے ہمیں غلبہ دین کے لئے انتخابات اور کلاشنکوف جیسے شارٹ کٹ استعمال کرنے کی بجائے مثبت انداز میں سیرت طیبہ ؐ کی روشنی میں دیوانہ وار سب کچھ کھپا کر جدوجہد کرنی چاہئے۔ اور سیرت ہی سے تدریج و حکمت انقلاب کی رہنمائی حاصل کرنی چاہئے۔ اگر ہم نے خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور خالص اتباع مصطفیٰ ﷺ میں جد وجہد جاری رکھی تو ان شاء اللہ العزیز وہ وقت جلد آئے گا جب حالات کے ستائے ہوئے اور روحانی سکون کے متلاشی انصار اللہ دو تین لاکھ کی تعداد میں میسر آجائیں گے۔ لیکن اگر بالفرض یہ مرحلہ نہ آئے تو ہم اللہ تعالیٰ کے حضور معذرت تو پیش کر سکیں گے کہ ہم نے صحیح نہج پر اپنی پوری توانائیاں لگائیں لیکن حالات ہی موافق پیدا نہ ہو سکے تھے۔ تو یقیناً ایسے اہل ایمان اخروی فلاح پا جائیں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم اپنی جدوجہد میں کوئی کمی نہ چھوڑیں۔ اگر ہم ایسا کر گزریں تو اللہ سے بڑھ کر محنتوں کا قدر دان اور کون ہوگا۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

منظم افراد کی مطلوبہ تعداد میسر آجائے جو کندن بن چکے ہوں تب عملی اقدام کا مرحلہ آئے گا کہ پرامن اور منظم گھیراؤ اور پکٹنگ کرتے ہوئے وقت کے طاغوت کو بتا دیا جائے کہ ہمارے جیتے جی یہ باغیانہ نظام نہیں چل سکے گا۔ گولیاں چلیں تو سینے حاضر کر کے جام شہادت نوش کیا جائے گا لیکن اس گروہ کی طرف سے تشدد' پتھراؤ اور جلاؤ ہرگز نہ ہوگا کیونکہ اس طرح حکومت کے لئے تحریک کو کچلنے کا واضح جواز فراہم ہو جاتا ہے۔ پھر موجودہ دور میں

جدید اسلحہ سے لیس' پیشہ ور افواج کی حامل نیز بین الاقوامی پشت پناہی رکھنے والی حکومتوں سے نہتے عوام محض جذبے سے فتح حاصل نہیں کر سکتے۔ اس طرح اخروی کامیابی تو ہو جائے گی لیکن غلبہ دین کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ جبکہ اگر عوام اپنے جائز حقوق کے لئے منظم اور پر امن انداز میں سیلاب بن کر اٹھ کھڑے ہوں تو پھر انہیں کچلنا حکومتوں کے بس میں نہیں ہوتا نیز صرف رضائے الٰہی کی خاطر قربانیاں دینے والوں کو خاموش اکثریت میں سے اس وقت حمایت میسر آئے گی کیونکہ وہ چاہتے تو ہیں کہ کوئی میدان میں نکلے لیکن قبل از وقت میدان میں نکلنا تحریک کے کچلے جانے کا ہی باعث بن سکتا ہے لیکن مناسب تعداد اور تیاری پر میدان میں نکلی ہوئی منظم قوت ایسا سیلاب بن جاتی ہے جو بڑھتے بڑھتے طاغوت کی ان جڑوں کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ دراصل طاغوت کی محافظ جڑیں شہادت کے جذبے سے لیس عوامی سیلاب ہی کے ذریعے اکھڑ سکتی ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے برسات میں شدید طغیانی کے بعد زرعی اراضی کی اپنی شناخت تک ختم ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مٹی تک تبدیل ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح سرفروشی کے سیلاب کے نتیجے میں طاغوت کی ایک ایک جڑ نیست و نابود ہو جاتی ہے اور مفاد کے یہ بندے جانیں بچانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں' نہ تو کوئی جاگیروں کا مالک رہتا ہے نہ سرمایہ داری کا مکروہ دھندا اور نہ ہی کرپٹ افسر شاہی اور زرد صحافت کا وجود رہتا ہے۔ بلکہ سبھی اس سیلاب میں بہہ جاتے ہیں۔ دراصل انقلاب نام ہی اس صورتحال کا ہے کہ قوت کے تمام مراکز ختم ہو کر خلا کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ تب انقلابی قیادت اپنے نظریات کے مطابق پورے نظام کی تعمیر نو کر کے اس خلا کو پر کرتی ہے۔ بندوبست اراضی بالکل نئی یعنی اسلامی بنیادوں پر تب ہی ہو سکتا ہے' ورنہ کسی کو کس طرح کس قانون کے تحت موروثی جاگیر سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ اسی صورت میں نیا نظام معیشت اور نظام تعلیم نافذ ہو سکتا ہے۔

تخریب حسیں کر دیتی ہے تعمیر کے نقص ناقص کو
بت خانے کی قسمت کیا کہیئے اجڑے تو حرم ہو جاتا ہے

تعمیر نو کے لئے فاسد بنیادوں کو گرانا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ایسا لازمی ضرورت نہ ہوتا تو رؤف و رحیم ہستی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی انسان تو کجا کسی جانور کا ایک قطرۂ

خون بھی نہ بہنے دیتے۔ لیکن عدل اور امن قائم کرنے کے لئے اس راہ کی رکاوٹیں گرائے بغیر کامیابی کا کوئی تصور ہی نہیں۔ چونکہ آسانی سے کوئی اپنے مفادات چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا' بلکہ دفاع کے لئے تمام تر قوت کو جھونک دیا جاتا ہے' اس لئے نظام طاغوت کے محافظ طبقات کبھی بھی ہنسی خوشی راستہ نہیں چھوڑیں گے کہ آیئے آپ اسلام کا نظام عدل و مساوات قائم کر کے ہمیں مال مفت سے محروم کر دیجئے۔ ایسا ہرگز نہ کبھی ہوا' نہ آئندہ ہوگا۔ نیز نہ ہی سمجھوتے اور تدریج سے یہ قوتیں اپنے مفاد سے دستبردار ہونے کو تیار ہوا کرتی ہیں۔ سوائے اس کے کوئی حل نہیں کہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے ان دنیا پرستوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا جائے۔ لیکن ہمارے مخلص دینی قائدین اگر رسول اللہ ﷺ کی سیرت اپنانے کی بجائے عملاً خود کو امن پسند ثابت کرتے ہوئے "آئینی راستوں" ہی کے ذریعے جدوجہد کرنے پر بضد رہیں اور یہ جواز پیش کرتے رہیں کہ کوئی میدان بھی خالی نہیں چھوڑنا چاہئے تو وہ شوق سے ایسا کریں' لیکن اس میدان میں موجود رہنے کے لئے جن جن قوتوں سے تعاون کر کے یہ انہیں تقویت پہنچانے کا باعث بنتے ہیں اس کے دنیوی نتائج کا بھی حدیث نبویؐ کی روشنی میں جائزہ لیں کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان عطار کی ہم نشینی کرے تو عطر اگر نہ بھی خریدے تو اس کے بدن و لباس میں سے خوشبو ضرور آتی ہے' اسی طرح کسی لوہار کی بھٹی پر مجلس رکھے تو کام نہ کرنے کے باوجود لباس ضرور داغدار ہو ہی جاتا ہے۔ اس لئے ان معزز قائدین کو ضرور سوچنا چاہئے کہ ان سیاسی گروہوں کی ہم نشینی سے ان کی اور وابستگان کی معاشرت اور کردار و عمل پر کیا کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اسی طرح دوسری حدیث نبویؐ کی روشنی میں بھی انہیں اپنا جائزہ لے کر سوچنا چاہئے کہ کسی بدعتی کی تقویت کے لئے صاحب ایمان دو قدم بھی چلے تو اللہ کا عرش کانپ اٹھتا ہے۔

ضرورت پڑنے پر جن سیاسی افراد کو یہ قائدین دین دشمن تک کہتے ہیں ان کو تقویت پہنچانے اور اس تقویت کے نتیجے میں ان سیاسی لوگوں کی طرف سے اٹھائے گئے خلاف دین اقدامات کا جواب ان معزز قائدین اسلام کو ضرور سوچنا چاہئے۔ یہاں کے جواب کو چھوڑیں' اس مقام کے سوال و جواب کی کیفیت کو ہمیں ہر لحظہ سامنے رکھنا چاہئے

جہاں کوئی تاویل کام نہ آئے گی' جب ہمارے اپنے اعضاء ہمارے خلاف گواہی دیں گے۔ یقیناً اس راہ سے اسلام کا عادلانہ نظام اپنی اصل صورت میں تو کبھی نہ آسکے گا البتہ اس طرح شیطان ضرور خوشیاں منائے گا کہ اس نے غلبہ دین کے داعیان کو اسمبلی کی چند سیٹوں' ترقیاتی فنڈز اور پروٹوکول کے جال میں الجھا کر ان سے ان کی منزل چھین لی ہے۔

جبکہ دوسری طرف جن کا دل قرون اولیٰ کے متبرک طریقے پر ٹھکے تو وہ اپنا تعلق کتاب انقلاب اور راہ انقلاب سے پختہ تر کرتے چلے جائیں اور گلی گلی دیوانوں کی طرف مئے توحید لے کر پھریں۔ یقیناً اس مے کے متوالے منتظر بیٹھے ہیں' لیکن کوئی قدم تو بڑھائے۔

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

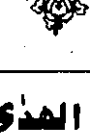

بقیہ : الھدیٰ

کرنا ناممکن ہے۔ وہ خون کے پیاسے کہ جن کے ظلم و ستم کے باعث آٹھ ہی سال پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جانثار ساتھی اپنی آبائی سرزمین مکہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے اور بمشکل اپنی جان سلامت لے جاسکے تھے' وہی لوگ مغلوبیت کی حالت میں آپؐ کے سامنے تھے اور پورے طور پر آپؐ کے رحم و کرم پر تھے۔ لیکن بجائے اس کے کہ انہیں کوئی لعنت ملامت اور سرزنش کی جاتی' لسانِ نبوت سے یہ الفاظ جاری ہوتے ہیں کہ میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے ان بھائیوں سے کہی تھی جنہوں نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ دشمنی کا معاملہ کیا تھا' یعنی ﴿لَاتَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں۔ "اِذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ" جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو۔ (جاری ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"تقدیم" بر دستورِ انجمن

اپریل ۹۵ء میں شائع شدہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے "دستور" کے حالیہ ایڈیشن کے لئے امیر تنظیم اسلامی کی تحریر، جو اَب دستور کے "مقدّمے" کی حیثیت رکھتی ہے

۲۱/اپریل ۱۹۹۵ء کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اپنا ۲۳واں سالانہ اجلاس منعقد کر رہی ہے۔

ادھر ۲۶/اپریل ۹۵ء کو راقم الحروف کی حیات دنیوی کے بھی شمسی حساب سے تریسٹھ سال پورے ہو رہے ہیں۔ (جو قمری حساب سے پینسٹھ کے لگ بھگ ہوں گے۔)

اگرچہ راقم کا حال تو یہ رہا ہے کہ اب سے تقریباً ساڑھے پانچ سال قبل جب "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" نامی کتاب کا مقدمہ تحریر کیا تو اپنے قلبی احساسات کی ترجمانی ان الفاظ سے کی تھی :

> "اور اب جبکہ راقم کی عمر شمسی حساب سے اٹھاون اور قمری تقویم سے ساٹھ برس ہوا چاہتی ہے'... راقم کی قلبی کیفیت فی الواقع وہی ہے جو انشاء اللہ خان انشاء کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے کہ ؎
>
> کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
> بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں!
>
> اور میں واقعتاً اپنے آپ کو الفاظِ قرآنی : "وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ○" (الواقعہ : ۸۵) کے مصداق عالمِ آخرت سے قریب تر اور عالمِ دنیا سے ذہناً اور قلباً بعید اور منقطع محسوس کرتا ہوں...."

تاہم دو سال قبل سے تو راقم پر یہ احساس بہت شدت کے ساتھ طاری ہو چکا ہے کہ "مسنون عمر" ختم ہو چکی ہے اور اب جو مہلت مزید مل رہی ہے وہ "نفل" کے

درجہ میں ہے[1]۔ لہٰذا جہاں ایک طرف ذاتی اعتبار سے کم از کم مولانا حالیؔ کے الفاظ میں ع "اب عصا بنوایئے نخلِ تمنّا کاٹ کر!" کا معاملہ ہو جانا چاہئے' وہاں دوسری جانب اپنے جملہ دینی کاموں اور تنظیمی ہیئتوں کے ضمن میں بھی سوچ کو آوازۂ "فلاں نہ ماند!" کے بعد کے دور کے مسائل و معاملات پر مرکوز ہو جانا چاہئے۔ جبکہ انجمن کے دستوری اور قانونی ڈھانچے میں یہ انقلابِ عظیم برپا ہو جائے گا کہ نہ کسی کی صدارت "تاحینِ حیات" ہوگی' نہ کسی صدر کے ہاتھ میں ویٹو (Veto) کی "تلوار" نظر آئے گی۔

بنا بریں' گزشتہ دو سالوں کے دوران انجمن کے مشاورتی قاعدے کو وسیع تر کرنے اور اس کے دستور اور قواعد و ضوابط کو تفصیل کے ساتھ اس طور پر مرتب کرنے کی حتی الامکان بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ کوئی ایسا ابہام اور قانونی خلا باقی نہ رہنے پائے جس سے میرے بعد پیچیدگی پیدا ہونے کا امکان ہو۔ اس ضمن میں شدید محنت اور عرق ریزی تو رفیقِ بزرگ و شفیق سید سراج الحق صاحب نے کی ہے۔ تاہم بھرپور قانونی مشورہ خواجہ محمد عظیم صاحب ایڈووکیٹ کا حاصل رہا ہے۔ (اللہ تعالیٰ ان دونوں کو وافر اجر و ثواب عطا فرمائے' آمین!) بہرحال اس سب کا حاصل اب وابستگانِ انجمن کی خدمت میں پیش ہے!

انجمن کے قیام کے لئے اولاً ۲۱/ مارچ ۱۹۷۲ء کو' میرے علاوہ' سات حضرات نے "قراردادِ تاسیس" پر دستخط ثبت کئے تھے اور ساتھ ہی مجھے یہ اختیار دیا تھا کہ "مناسب مشورے سے انجمن کے قواعد و ضوابط کا تفصیلی خاکہ تیار کر کے ماہنامہ "میثاق" لاہور میں شائع کردوں' تاکہ یہ تجویز عوام کے سامنے آجائے اور جو حضرات بطور مؤسس اس انجمن میں شرکت فرمانا چاہیں اور اس کے لئے پانچ ہزار روپیہ نقد زرِ تعاون پیش فرمادیں ان کا نام بھی مجلسِ مؤسسین میں شامل کیا جاسکے"۔
چنانچہ حسب قرارداد' انجمن کی تجویز اور اس کے قواعد و ضوابط کا خاکہ مع بعض اہم

---

[1] آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف تریسٹھ برس قمری حساب سے تھی!

توضیحات ماہنامہ "میثاق" کی اشاعت بابت جولائی ۷۲ء میں شائع کر دیا گیا' جسے ان ہی آٹھ حضرات نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۲/ اکتوبر ۷۲ء میں من و عن قبول کر لیا اور طے کیا کہ طے شدہ قراردادِ تاسیس' اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط کے ساتھ انجمن کی رجسٹریشن کے لئے درخواست رجسٹرار' جوائنٹ سٹاک کمپنیز پنجاب' لاہور کو دے دی جائے۔ الحمد للہ کہ یہ رجسٹریشن ۴/ نومبر ۱۹۷۲ء کو ان ہی آٹھ اولین مؤسسین کے ناموں کے ساتھ ہو گئی جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں :

۱ ۔ ڈاکٹر محمد یقین	۳۷۔ شادمان کالونی' لاہور
۲ ۔ میاں مقصود احمد اختر	۹۔ میاں عبد اللہ اسٹریٹ ڈھولنوال' لاہور
۳ ۔ ظہیر احمد خان' ایڈووکیٹ	۱۷۔ ای' گلبرگ ۳' لاہور
۴ ۔ میاں محمد رشید	(امریکہ منتقل ہو گئے ہیں)
۵ ۔ چوہدری نصیر احمد ورک	(گزشتہ سال انتقال فرما گئے' انا للہ و انا الیہ راجعون)
۶ ۔ جناب خادم حسین	۲۰۔ اورنگ زیب بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور
۷ ۔ شیخ محمد عقیل	۱۷/ ا' بلاک سی' ماڈل ٹاؤن' لاہور
۸ ۔ احقر راقم الحروف	حال مقیم ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور

حسب قرارداد متذکرہ بالا جن تیرہ (۱۳) حضرات و خواتین نے انجمن کے حلقہ مؤسسین میں شرکت قبول کی ان کے اسمائے گرامی اور موجودہ پتے حسب ذیل ہیں :

۱ ۔ جناب اقتدار احمد	۷۸' سیکٹر ا۔ A' ٹاؤن شپ' لاہور
۲ ۔ بیگم اللہ بخش سیال	لغاری کالونی' صادق آباد
۳ ۔ ڈاکٹر ایس۔ آئی سرور	سرور جنرل ہسپتال' بھلوال' ضلع سرگودھا
۴ ۔ ڈاکٹر ظہیر احمد	عبد الکریم روڈ' قلعہ گوجر سنگھ' لاہور
۵ ۔ ڈاکٹر عبد اللطیف خاں	۸۵ء میں انتقال فرما گئے' انا للہ و انا الیہ راجعون
۶ ۔ بیگم عبد اللطیف خاں	۹۷۔ ایف' بلاک بی' شمالی ناظم آباد' کراچی
۷ ۔ ڈاکٹر عبد المجید	۹۷۔ ای' بلاک ایف' شمالی ناظم آباد' کراچی
۸ ۔ جناب فیض رسول	۳۵۔ اے' فیز ۲' ہاؤسنگ سوسائٹی ماڈل ٹاؤن لنک روڈ' لاہور
۹ ۔ جناب قمر سعید قریشی	۹۶۷۔ این سمن آباد' لاہور

۱۰ - جناب شیخ محمد یٰسین ۱۹۷۵ء میں انتقال فرما گئے' انا للہ و انا الیہ راجعون
۱۱ - جناب میاں منظور الحق ۸۶ء میں انتقال فرما گئے' انا للہ و انا الیہ راجعون
۱۲ - ڈاکٹر نور الٰہی ۹۵ - بی بہار' مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی' بلاک نمبر ۷- ۸ کراچی نمبر ۸
۱۳ -جناب وقار احمد خیبر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن' لاہور

(نوٹ : یہ فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی گئی تو یہ عجیب اتفاقی صورت حال سامنے آئی کہ اس میں اول و آخر میرے دو حقیقی بھائی ہیں اور نمبر دو پر میری ایک حقیقی ہمشیرہ۔)

اس فہرست میں سے ان تین حضرات کے علاوہ جن کا انتقال ہو چکا ہے' باقی سترہ مؤسسین میں سے الحمدللہ کہ جن حضرات کا زرِتعاون تاحال باقاعدہ موصول ہو رہا ہے ان کی تعداد دس ہے۔ جو افتراق و انتشار اور خود رائی و خود سری کے موجودہ ماحول میں بسا غنیمت اور لائق صد شکر ہے۔

ان بیس ابتدائی کوششوں کے بعد سے اب تک ان ہی کی مساوی شرائط پر ۲۹۳ حضرات انجمن کے ساتھ "محسنین" کی حیثیت سے شامل ہو چکے ہیں' اور ۱۶۶ حضرات "مستقل ارکان" کی حیثیت سے۔ مزید برآں' اس وقت انجمن کے عام ارکان کی تعداد ۷۰۲ ہے۔

دنیا کی دوسری عام سماجی یا مذہبی انجمنوں کے برعکس اس انجمن کا ایک خاص پس منظر تھا (جس کی وضاحت اس مختصر تحریر سے ہو جاتی ہے جو راقم نے ۱۹۷۲ء میں تحریر کی تھی' اور اب بھی "پس منظر" کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہے۔) اور اسی کی بنیاد پر اس کا دستوری ڈھانچہ بھی منفرد شان کا حامل رہا ہے۔ یعنی یہ کہ اس میں اصل حیثیت و اہمیت اس عاجز و ناچیز کو حاصل رہی ہے اور باقی سب حضرات نے گویا میرے معاونین و انصار کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ چنانچہ اس میں میری تاحینِ حیات صدارت بھی طے شدہ ہے اور مجھے پالیسی اور اخراجات کے ضمن میں کل اختیارات بھی حاصل ہیں حتیٰ کہ مجلس منتظمہ (اور اب مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ) کے فیصلوں کے خلاف ویٹو کا اختیار بھی حاصل ہے۔

الحمد للہ کہ ان جملہ امور کے ضمن میں ضروری وضاحتیں انجمن کے ابتدائی خاکے کے ساتھ ہی شائع کر دی گئی تھیں۔ لہٰذا بعد میں ان کے سلسلے میں کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہ تھا (یہ وضاحتیں بھی شامل اشاعت ہیں۔) ------ ویسے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس ۲۳ سال کے عرصے میں انجمن کا کام انتہائی ہمواری اور خوش اسلوبی سے جاری رہا------ اور ایک بار بھی مجھے اپنے حقِ استرداد (Veto) کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑی! مزید برآں نہ ہی آج تک انجمن کا کوئی اختلاف پبلک کے سامنے آیا' نہ کسی نے عدالت سے رجوع کیا۔ حتیٰ کہ ایک دو بار کے سوا کبھی انجمن کے کسی اجلاس عام یا مجلس منتظمہ' مجلس عاملہ یا مجلس شوریٰ کے اجلاس میں کسی تلخی یا باہم بلند آواز سے بات کرنے تک کی نوبت نہیں آئی۔

اس میں یقیناً انجمن کے شرکاء کے خلوص و اخلاص کے علاوہ اصل دخل اس نظام کو ہے جسے راقم نے ٹھیٹھ دینی روایات کی اساس پر اختیار کیا تھا۔ گویا اصلاً یہ برکات قرآن و سنت کی ہیں۔

اسی خاص نظام کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ ایک ایسی انجمن کا دستور تاحال نہایت مختصر تھا جو تئیس سال سے کام کر رہی ہے اور جس کے ذریعے' کسی ملکی یا غیر ملکی سرکاری امداد کے بغیر' خالص نجی ذرائع سے حاصل شدہ کروڑوں روپے صَرف ہو چکے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا کہ اس نے راقم کو ابتداء ہی میں ایک ایسا مالیاتی نظام سجھا دیا جس کے تحت اس کے باوجود کہ نظری طور پر مصارف کا کل اختیار میرے پاس رہا ہے' میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آج تک انجمن کے ایک پیسے کو بھی ہاتھ نہیں لگایا! اس لئے کہ انجمن کے کرنٹ اکاؤنٹ نمبر ۱ میں سے' جو میری تحویل میں ہوتا ہے' براہ راست ایک پیسہ بھی نہیں نکالا جا سکتا اور کُل خرچ کرنٹ اکاؤنٹ نمبر ۲ سے ہوتا ہے جسے انجمن کے ناظم اعلیٰ اور ناظم بیت المال مشترکہ طور پر Operate کرتے ہیں۔

گزشتہ تئیس سال کے عرصے میں انجمن سے جو بھی خدمت بن آئی ہے (اور جس کی پانچ سال قبل تک کی کارگزاری کا ایک ہلکا سا تصور "دعوت رجوع الی القرآن"

نامی کتاب سے لگایا جا سکتا ہے۔) وہ اولاً سراسر اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید سے ہوئی اور ثانیاً میرے ساتھ انجمن کے جملہ وابستگان کے تعاون و نصرت سے'---- میں اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ ساتھ ان سب کا بھی تہہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے ساتھ میری بھی جو حقیر توانائیاں صرف ہوئی ہیں انہیں شرفِ قبول عطا فرمائے۔

ع شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!

راقم اپنے مشن کے عملی آغاز کے لئے ۱۹۶۵ء میں لاہور منتقل ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک تیس سال کے طویل عرصے کے دوران میں اس نے جو کچھ بھی کیا' بحمداللہ' حدیث نبویؐ میں وارد شدہ الفاظ "ایماناً واحتساباً" کے مطابق کیا۔ یعنی اولاً اس ایمان اور ایقان کی بنیاد پر کیا کہ یہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی رو سے میرے دینی فرائض ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کی مقدور بھر سعی مجھ پر لازم ہے۔ اور ثانیاً اس لئے کیا کہ اللہ کی رضا اور آخرت کا اجر و ثواب حاصل ہو۔ لہٰذا اس کے ضمن میں الفاظِ قرآنی : "لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُورًا" کے مصداق کسی اور سے نہ کوئی بدلہ مقصود تھا نہ احسان مندی۔ (بلکہ راقم تو خود ان جملہ رفقاء و معاونین کا تہہِ دل سے "احسان مند" ہے جنہوں نے عام محاورے کے مطابق "دامے' درمے' سخنے" اور اصطلاح قرآنی کے مطابق "جان اور مال کے ساتھ" راقم کے مشن میں تعاون فرمایا۔)

مزید برآں' دین کے تمام خادموں کے لئے تو جملہ انبیاء و رسل کے اس اسوہ کا اتباع لازم ہے کہ : "وَمَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ' إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝" (الشعراء : ۱۰۹ - ۱۲۷ - ۱۴۵ - ۱۶۴ - ۱۸۰) گویا کسی اجر یا اجرت اور تنخواہ و مشاہرہ کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں!

تاہم یہ دنیا عالمِ اسباب ہے' اور اگرچہ اللہ تعالیٰ جملہ اسباب کا "مسبّب" بھی خود ہی ہے' لیکن اس کی تائید و نصرت بھی انبیاء و رسل کے سوا جن کے لئے وہ خارقِ

عادت معجزات کی صورت میں بھی ظاہر ہوتی رہی ہے' عام انسانوں کے لئے ظاہری اسباب اور مادی وسائل ہی کے پردے میں کارفرما ہوتی ہے۔

چنانچہ جب میں نے فروری ۱۹۷۱ء میں حج کے موقع پر عین حرمِ مکی میں کسی بھی قسم کے محسوس اور مرئی معاشی ذرائع کے بغیر' خالصتاً اللہ کی رزّاقیت پر توکّل کرتے ہوئے' میڈیکل پریکٹس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ وقت اور ہمہ تن خدمتِ دین کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا تو قدرِ قلیل امتحان و ابتلاء کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے اس کی نصرت کے دروازے کھلتے چلے گئے جن میں چھوٹے بھائیوں کے تعاون کے ساتھ ساتھ ایک ہی سال کے عرصے میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام اور اس کی جانب سے نہ صرف رہائش بلکہ اس کے جملہ متعلقات (پانی' بجلی' گیس وغیرہ) کی بلامعاوضہ سہولتوں کی "بالاصرار" پیشکش بھی ہرگز کم اہم نہ تھی! (ان جملہ امور کی تفصیل راقم نے "حسابِ کم و بیش" نامی کتابچے میں درج کر دی ہے۔) چنانچہ اگر آج مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ایک تناور درخت کے مانند دور دراز کی شہرت اور نیک نامی کے حامل ادارے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے ذیلی ادارے یعنی جامع القرآن سمیت قرآن اکیڈمی' اور قرآن آڈیٹوریم کے ساتھ قرآن کالج وسیع و عریض اور بلند و بالا عمارتوں کی شکل میں نظر آتے ہیں تو ان کی بنیاد میں جہاں راقم کے جسم و جان کی توانائیاں اور ذہنی اور فکری صلاحیتیں صَرف ہوئی ہیں وہاں خود ان توانائیوں اور صلاحیتوں کی تولید و تسلسل میں انجمن کی جانب سے حاصل شدہ سہولتوں کو فیصلہ کُن دخل حاصل ہے۔

اس "اعترافِ حق" کے پس منظر میں تین ایسے امور کا تذکرہ مقصود ہے جو "انجمن کے صدر مؤسّس اور تاحینِ حیات صدر" کے "انتقال یا اس سے قبل کسی سبب سے از خود سبکدوش ہو جانے" کے بعد کے دَور سے متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک کا تذکرہ میں پہلی بار اس تحریر ہی کے ذریعے کر رہا ہوں (جو گویا ۲۱/اپریل ۹۵ء کے اجلاس عام ہی میں پہلی مرتبہ وابستگانِ انجمن کے علم میں آئے گا۔) اور دُوسرے دو امور وہ ہیں جو اس سے قبل علی الترتیب مجلسِ منتظمہ اور مجلسِ شوریٰ میں تو طے ہو چکے ہیں

تاہم چونکہ ان کے ضمن میں بظاہر "وَمَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ" والے قاعدہ کلیہ کی خلاف ورزی نظر آتی ہے لہٰذا کسی قدر وضاحت کی ضرورت ہے۔

پہلی بات ---- میری یہ خواہش ہے کہ، اگرچہ میں تہہِ دل سے اس "ارزل العُمر" سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتا ہوں جس میں انسان "از کارِ رفتہ" ہو جاتا ہے، تاہم اگر بالفرض، خدانخواستہ، یہ صورت میرے ساتھ پیش آ ہی جائے اور میں انجمن کی صدارت سے "از خود سبکدوش" ہو جاؤں تب بھی مجھے تادمِ مرگ متذکرہ بالا سہولتیں حاصل رہیں تاکہ میرا جنازہ اسی ادارے کی چار دیواری سے نکلے جہاں میں نے تادمِ تحریر اپنی حیاتِ مستعار کے سوا اٹھارہ برس بسر کئے ہیں۔

دوسری بات ----- جو انجمن کی مجلس منتظمہ کے اجلاس منعقدہ ۸/ فروری ۱۹۹۱ء میں طے ہو گئی تھی ------ یہ ہے کہ میرے انتقال کے بعد بھی میری اہلیہ کو ان کی وفات تک اسی فلیٹ میں رہائش کی سہولت جملہ متعلقات سمیت حاصل رہے گی جس سے میرا جنازہ اٹھے ----- مزید برآں انہیں حلقہ خواتین میں تعلیم و تدریس کے ضمن میں بھی وہ جملہ سہولتیں حاصل رہیں گی جو اِس وقت حاصل ہیں۔

تیسری بات ------ انجمن کی موجودہ مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۴ء کا یہ فیصلہ ہے کہ : "صدر مؤسس کے بیٹوں کو انجمن کے قواعد و ضوابط میں طے شدہ اس پابندی سے مستثنیٰ کر دیا جائے جس کے مطابق مجلس شوریٰ کے انتخابات کے لئے ان وابستگانِ انجمن کے نام تجویز نہیں کئے جا سکتے جو انجمن کے زیرِ کفالت ہوں یا انجمن کے کسی منفعت بخش عہدہ پر فائز ہوں"۔

اس کے ضمن میں پہلی وضاحت تو یہ ضروری ہے کہ اگرچہ یہ خیال اولاً خود میں نے ہی مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ۳/ جون ۹۴ء میں پیش کیا تھا، تاہم اس اجلاس میں تو اس پر کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا تھا اور اگلے اجلاس (۱۴/ اکتوبر ۹۴ء) میں مَیں نے اس تجویز کو اس بنا پر واپس لے لیا تھا کہ ایک محترم رکن شوریٰ نے جو میرے قدیمی رفیق کار ہیں (جو پہلے اجلاس میں موجود نہیں تھے) اس پر کسی قدر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن پھر اس تجویز کو ایک معزز رکن شوریٰ وکیل احمد خاں صاحب نے شد و مد کے

ساتھ اپنی جانب سے تجویز کے طور پر پیش کیا جس پر وہ "بالاتفاق" منظور ہوئی۔

دوسری وضاحت یہ کہ خود میرے ذہن میں یہ بات صرف اس لئے آئی تھی کہ کسی نظریاتی ادارے کے مستقبل کے لئے اہم ترین مسئلہ اس کے اساسی نظریئے اور فکر کے پوری صحت اور درستی کے ساتھ بقاء و تسلسل اور استقرار و استمرار کا ہوتا ہے۔ تو اگرچہ بحمداللہ اِس وقت میرے شاگردوں یعنی "معنوی بیٹوں" کی ایک بڑی تعداد ایسی موجود ہے جس نے میرے افکار و خیالات کو نہ صرف بخوبی سمجھا ہے بلکہ حرزِ جان بھی بنایا ہے' اور ان میں سے بعض اپنے جوشِ کار اور جذبۂ عمل میں میرے صُلبی بیٹوں سے بہت بڑھ کر بھی ہیں' تاہم چونکہ میرے صلبی بیٹے بالکل بچپن ہی سے میرے دروس اور خطابات میں شرکت کرتے رہے ہیں' بالخصوص عزیزان عارف رشید اور عاکف سعید سلمہما کو تو علی الترتیب ساڑھے نو اور سوا سات برس کی عمر سے میرے درس سنتے ہوئے پورے تیس برس ہو گئے ہیں لہٰذا ان کے دماغوں کے کمپیوٹر میں میرا فکر جس طرح تہ بر تہ نہ صرف شعور بلکہ تحت الشعور کی بھی سب سے نچلی سطحوں تک feed ہوا ہے شاید اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہ ہو۔ بنابریں ان کا' صدارت وغیرہ کے عہدوں سے قطع نظر' انجمن کے پالیسی ساز ادارے یعنی مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لئے بھی نااہل قرار پانا انجمن اور اس کے تاسیسی مقاصد کے اعتبار سے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اسی بنا پر میں نے چند سال قبل عزیزم ڈاکٹر عارف رشید سلمہٗ کو انجمن کی ملازمت سے فارغ کرا دیا تھا تاکہ وہ اپنی معاش کے لئے کوئی جزوقتی سلسلہ اختیار کرلیں اور اس طرح انجمن کی مجلس منتظمہ کے رکن منتخب ہونے کے اہل قرار پا سکیں۔ ایسی ہی ایک تجویز عزیزم عاکف سعید سلمہٗ کے لئے بھی پیش ہوئی تھی (جس کی جانب آنعزیز کا اپنا رجحان بھی قوی تھا) لیکن میں نے اسے سختی کے ساتھ رد کر دیا۔ اس لئے کہ اس طرح انجمن کے مقاصد کو ایک دوسرے پہلو سے شدید نقصان پہنچتا ہے۔ الغرض یہ ہے میرے بعد کے دور میں انجمن میں میرے بیٹوں کے "واحد" ترجیحی معاملے کا پس منظر! ... جس سے واحد مقصود' اللہ شاہد ہے' کہ انجمن اور اس کے مقاصد کے استحکام کے سوا اور کچھ نہیں!..... ویسے گمانِ غالب یہ بھی ہے کہ یہی ان دو انتہائی متضاد صورتوں

کے مابین بہترین اعتدال کی راہ ہے' جو دینی اداروں یا مذہبی تنظیموں کے بارے میں عام طور پر نظر آتی ہیں ---- یعنی یا یہ انتہائی کیفیت کہ دینی ادارے موروثی جائیداد بن جاتے ہیں' یا یہ دوسری بالکل متضاد صورت کہ دینی تحریکوں کے داعیوں اور تنظیموں کے سربراہوں کی اولاد کا ان تحریکوں اور تنظیموں کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم!

میں تو اصلاً اپنی بات اسی مقام پر ختم کر چکا تھا۔ لیکن بعد میں خیال آیا کہ ایک اور معاملے کا تذکرہ بھی ہو جانا مناسب ہے جس کا میری ذات کے ساتھ "نَسَبًا" نہیں تو "صِهْرًا" (الفرقان : ۵۴) تعلق بہرحال موجود ہے۔

جملہ وابستگانِ انجمن کے علم میں ہے کہ انجمن کی اہم ترین ذمہ داری یعنی نظامتِ علیا کے فرائض عرصہ پانچ سال سے محترم سراج الحق سید صاحب ہمہ وقت' ہمہ تن اور بہمہ وجوہ صدفی صد خالص اعزازی طور پر سرانجام دے رہے ہیں۔ (یہاں تک کہ وہ اکیڈمی کے جس فلیٹ میں رہائش پذیر ہیں اس کا بھی کرایہ ادا کرتے ہیں!) ادھر سید صاحب بھی نہ صرف یہ کہ عمر میں مجھ سے بھی کئی سال بڑے ہیں بلکہ گوناگوں عوارض سے بھی مجھ سے بڑھ کر دوچار ہیں۔ بنا بریں دو تین سال قبل ایسے متعدد وابستگانِ انجمن کو ان کی "جانشینی" کے لئے تیار کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی جو جوان اور باصلاحیت بھی ہوں اور اس درجہ فارغ البال بھی کہ اعزازی ناظمین کی فہرست میں جگہ پا سکیں۔ لیکن جب تین چار حضرات کے ضمن میں ایسی کوششیں ناکام ہوئیں تو بالآخر ع "ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر!" کے مصداق راقم نے اپنے خویشِ کلاں عزیزم محمود عالم میاں سلمہ' کو "حکم" دیا کہ اپنی ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ حاصل کریں۔ وہ چونکہ مجھ سے اس "صہری" تعلق پر مستزاد "بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف" کے رشتے میں بھی منسلک ہیں' لہٰذا انکار کی مجال نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تقریباً آٹھ ماہ تک اپنی کُل تنخواہ کے ساتھ "جمع شدہ" استحقاقی

رخصت حاصل کر کے' اور پھر چھ ماہ تک نصف مشاہرے پر رخصت لے کر پورا وقت سید صاحب کی زیر تربیت انجمن کے مدیر عمومی کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر کچھ عرصہ دوبارہ ملازمت پر حاضر ہو کر جز وقتی طور پر بعض فرائض انجام دیئے ---- اور اب' ان شاء اللہ' یکم جون ۱۹۹۵ء کو پوری طرح ریٹائر ہو کر انجمن کی ہمہ وقت خدمت کے لئے حاضر ہو رہے ہیں!

واضح رہے کہ وہ ایم ایس سی (کیمسٹری) ہیں' اور پی سی ایس آئی آر میں گریڈ ۱۹ کی آخری حد کو پہنچے ہوئے ہیں' چنانچہ اِس وقت پندرہ ہزار کے لگ بھگ ماہانہ مشاہرہ پا رہے ہیں۔ اور ابھی ان کی ملازمت کے دس سال باقی تھے۔ جبکہ انجمن سے وہ حسب قرارداد مجلس منتظمہ ۱۸/ مارچ ۱۹۹۴ء میری ہی طرح کوئی تنخواہ نہیں لیں گے بلکہ صرف رہائشی سہولتوں سے متمتع ہوں گے۔ بلاشبہ یہ ان کا بہت بڑا ایثار ہے۔ (اللہ اسے قبول فرمائے! آمین)

گمانِ غالب ہے کہ یہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے دستور اور نظام سے متعلق آخری تحریر ہے جو میرے قلم سے نکلی۔ اب اس کے بعد تو ۔

"دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے۔ عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے!"

والا معاملہ ہے۔ اللہ خطاؤں سے درگزر فرمائے' اور انجام بخیر' اور عاقبت محمود فرمائے' آمین!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

لاہور۔ جمعہ ۱۴/ اپریل ۱۹۹۵ء

☆ ☆ ☆

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS

NTN BEARINGS

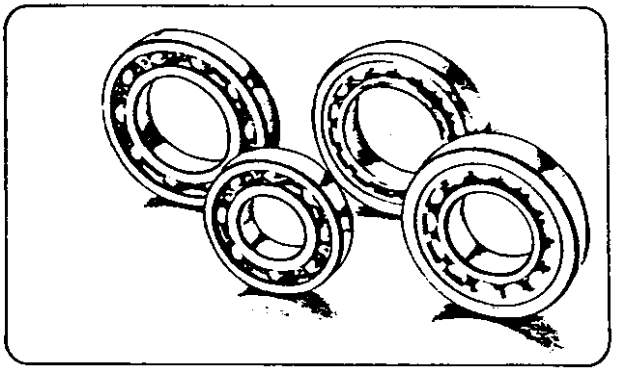

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65, Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : **(Opening Shortly)**	Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169
GUJRANWALA :	1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

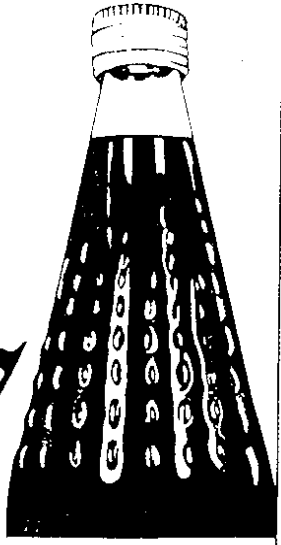

REG. NO. L-7360
VOL. 44 NO. 5
MAY 1995

MPL